ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

رنگین ٹی وی

مفت

تفصیل صفحہ ۳ پر

جون ۱۹۹۲ء

جرمی چیک

سگنل 2

سگنل 2

دانتوں کی مکمل حفاظت کے لئے

SGNL - 1 - 91 - C LASER DOT

B-LINTAS

11836

کس کے بھاگ بھلے ہیں
بخت آور ہے کون

آنکھ مچولی آپ کو رنگین ٹیلی وژن تحفے کے طور پر دینا چاہتا ہے

رنگین ٹی وی
وہ بھی مفت

دیکھیں خوش بختی کی چڑیا کس کے سر بیٹھتی ہے ؟ کون خوش نصیب رنگین ٹی وی حاصل کرتا ہے

آپ زیر نظر شمارے کو اس صفحے سمیت محفوظ کر لیجئے ؛
اور آئندہ ماہ کے شمارے میں ٹی وی حاصل کرنے کے لیے
"لکی نمبر" ضرور دیکھئے ؛
اس صفحے پر لکھا ہوا لکی نمبر اگر قرعہ اندازی میں نکل آیا
تو ٹی وی آپ کا ہوا ؛

ہمیں یہ مکمل صفحہ کوپن میں اپنا مکمل نام، ولدیت، اسکول اور مکمل پتہ لکھ کر لکی نمبر سمیت بھجوا دیجئے ؛

ہم آپ کو

آپ کا ٹی وی بھجوا دیں گے • آپ کی تصویر شائع کریں گے • آپ کو مبارک باد پیش کریں گے

نام _____ ولدیت _____

عمر _____ کلاس _____ اسکول _____

پتہ جہاں ٹی وی بھجوایا جائے _____

_____ فون نمبر _____

ہمارا نیا پتہ : ماہنامہ آنکھ مچولی 1- پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

شاہ سنز اب پیش کرتے ہیں !

گولڈ فِش سِلکی

مکمّل
بال پین

ہزار زبانی تعریفوں سے آزمائش بہتر ہے۔

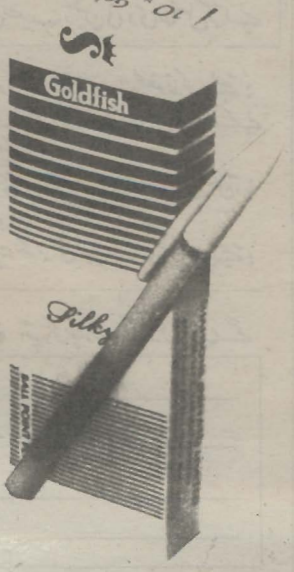

- سب سے زیادہ رواں
- مضبوط گرفت
- چلتے چلتے نہیں رُکتا
- دیرپا
- خوبصورت
- پُرکشش بناوٹ

SHAHSONS (PRIVATE) LIMITED
D/88, S.I.T.E., KARACHI—PAKISTAN. TEL: 296001—4.

ننھی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

مسلسل دوسری بار اعلیٰ معیار کا ایوارڈ حاصل کرنے والا
پاکستان کا واحد ماہنامہ

مدیر اعلیٰ ظفر محمود شیخ

مینجنگ ایڈیٹر ایم اے فاروقی

مشاورت مشفق خواجہ، امجد اسلام امجد

مدیران اعزازی طاہر مسعود، محمد سلیم مغل

مجلس ادارت منیر احمد راشد، محمد عمر احمد خان

اشتہارات محمد عرفان

نمائندہ امریکہ عبدالرشید خان

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن پاکستان چلڈرنز میگزین سوسائٹی،
آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے
تصدیق شدہ اشاعت

◇ ماہ نامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی سکتی۔

◇ ماہ نامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن وحدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا

◇ ماہ نامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیر سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا۔

جلد نمبر ۶ شمارہ نمبر ۱۲ جون ۱۹۹۲ ذیقعد/ذی الحجہ ۱۴۱۲ھ فون ۴۱۱۵۸۷ قیمت ۱۰ روپے، ۷ ریال، ۷ درہم

ناشر: ظفر محمود شیخ طابع: زاہد علی ۔ مطبع: لاریب پرنٹنگ پریس ایم اے جناح روڈ کراچی

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی ۷۔ ۱۔ پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

حسنِ ترتیب

تاریخ کے دریچے سے	غلام عباس طاہر	۸
ماہِ رواں کی پہلی بات	ظفر محمود شیخ	۹
بخدمت جناب	خطوں کے جواب	۱۱
باغ اور آگ	پروفیسر عنایت علیخان	۱۵
ببون	سلیم مغل	۲۱
گاؤں کا بیلہ (نظم)	شبیر بیگ ناز	۲۵
عید تماشہ	سلمان غزالی	۲۷
لکھنا اوٹ پٹانگ کہانی کا	نائلہ صدیقی	۳۲
جہاں اداسی نہیں ہوگی	طارق محمود میاں	۳۹
پانچ باتیں (نظم)	عبدالقادر	۴۶
شکریہ دادا جان	فرزانہ روحی	۴۹
ادیب گر	طاہر مسعود	۵۵
بارش	محمود شاہد	۶۳
آخرت کیوں ضروری ہے؟	ابنِ بلوچ	۶۸

حسنِ ترتیب

۷۱	(نظم)	پہیلیاں بوجھئے
۷۲	آصف فرّخی	چیزوں کی کہانی
۷۵	قارئین	(گلگلے) لطائف
۷۹	اظہر نیاز	کرشمہ
۸۷	م-الف-راشد	اسٹیمر بنائیے
۹۱	ایّاز محمود	درِ حیرت
۹۵	سیّد نظر زیدی	چندن کا جنگل
۱۰۰	عذرا جبیں	سائنس میلے میں
۱۰۳	اُسامہ بن سلیم	آپریشن چڑی پھانس
۱۱۲	اکبر علیخان عرشی زادہ	(نظم) ایک مباحثے کا حال
۱۱۳	پی سی ایم ایس	پاکستان چلڈرنز میگزین سوسائٹی
۱۱۹	مختصر تحریریں	قلم قتلے
۱۲۹	تعارف	ساتھی بچپن کے
۱۳۴	ہُما سلیم	امّی ابّو کا صفحہ

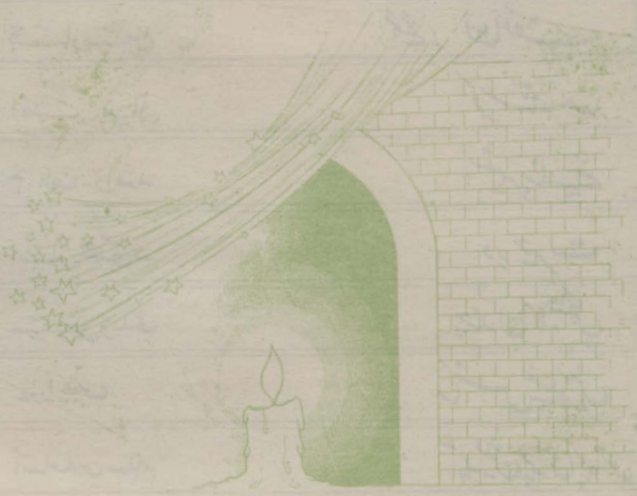

تاریخ کے دریچے سے

ایک مرتبہ سلطان محمود غزنوی نے کچھ قیمتی موتی اپنے افسران کے سامنے پھینکتے ہوئے کہا، ”انھیں چن لیا جائے۔“ اور خود آگے بڑھ گئے۔ تھوڑی دور جانے کے بعد مڑ کر دیکھا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایاز گھوڑے پر سوار پیچھے چلا آ رہا ہے۔ پوچھا، ”ایاز کیا تجھے موتی نہیں چاہئیں؟“ ایاز نے دست بستہ عرض کیا ”عالی جاہ! جو موتیوں کے طالب تھے وہ موتی چن رہے ہیں، مجھے تو موتی نہیں، موتیوں والا چاہئے۔“

(مرسلہ: غلام عباس طاہر، جھنگ)

ماہِ رواں کی پہلی بات

زندگی کا سارا حسن اعلیٰ قدروں کے احترام میں پوشیدہ ہے۔ ایثار یا قربانی بھی ان ہی اعلیٰ قدروں میں شامل ہے۔ ایثار کا مطلب ہے دوسروں کے فائدے کے لئے اپنے فائدے کو چھوڑ دینا۔ دوسروں کی خوشی کے لئے اپنی خوشی کو ترک کر دینا۔ ظاہر میں دیکھا جائے تو یہ بہت مشکل بات ہے، کیونکہ انسان کے اندر خود غرضی کا مادہ بھی ہوتا ہے اور اس جذبے پر اگر قابو نہ پایا جائے تو بعض اوقات یہ بہت منہ زور ہو جاتا ہے۔ ایثار کرنے یا قربانی دینے کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ آدمی اپنی خود غرضی پر قابو پائے۔ ایسا معاشرہ جس میں سب لوگ ہر وقت اپنے ہی فائدے کے بارے میں سوچتے رہیں کسی بھی طرح اچھا اور مہذب معاشرہ نہیں کہلا سکتا اور نہ وہاں کے لوگ سکھ چین سے رہ سکتے ہیں۔ جب آپ کسی کے آرام کے لئے تکلیف اٹھاتے ہیں تو اس سے جہاں آپ دوسرے کو فائدہ پہنچاتے ہیں وہاں خود بھی ایک روحانی خوشی حاصل کرتے ہیں۔ اس عمل سے آپ کا خدا بھی خوش ہوتا ہے اور آپ آخرت میں اپنی نیکیوں میں اضافہ بھی کرتے ہیں۔

غور کیجئے تو آپ کو احساس ہوگا کہ اس دنیا کا سارا نظام ہی ایثار و قربانی کی بدولت چل رہا ہے۔ والدین اولاد کے لئے تکلیفیں اٹھاتے ہیں اور اولاد اپنی اولادوں کے لئے۔ دنیا میں جتنی ترقی اور تعمیر نظر آتی ہے ان سب کے پیچھے کسی نہ کسی کی محنت اور کوشش کا دخل ہے جو بغیر جذبۂ ایثار کے ممکن نہیں تھی۔ اس کے برعکس جتنی خرابیاں اور بگاڑ ہیں وہ انسان کی خود غرضی سے پیدا ہوتے ہیں۔ آج آپ کے ارد گرد جو نفسا نفسی کا عالم ہے اور جو ہاہا کار مچی ہوئی ہے، یہ سب اسی فتنۂ خود غرضی کا نتیجہ ہیں۔

ہمارا مذہب ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو دوسروں کو ان کا حق دیتے ہیں اور احسان کرتے ہیں، اور اسے ایسے لوگ سخت ناپسند ہیں جو اپنی ناک سے آگے دیکھنا تک گوارہ نہیں کرتے۔ وہ لوگ جو اللہ کا حق ادا کرتے ہیں بندوں کا حق ادا کرتے ہیں اور خود اپنے نفس کا حق ادا کرتے ہیں، اللہ کے نزدیک محبوب ہیں۔ اللہ کا حق یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے، اس کا حکم بے چون و چرا مانا جائے۔ بندوں کا حق یہ

ہے کہ ماں، باپ، بھائی بہن، رشتہ دار، دوست احباب، پڑوسی، اور وہ سب لوگ جن سے واسطہ پڑتا ہے، ان کے اپنے اپنے حقوق ہیں، وہ سب ادا کئے جائیں۔ اور اپنے نفس کا حق یہ ہے کہ جو جائز ضروریات اور تقاضے ہیں انہیں پورا کیا جائے۔

ایثار و قربانی کی حقیقت یہ ہے کہ ان حقوق کی ادائیگی کی راہ میں، جو تکلیفیں اور مصیبتیں آئیں، انہیں صبر و ضبط کے ساتھ برداشت کیا جائے اور ان کی شکایت نہ کی جائے۔ وہ لوگ جو ایثار کی راہ اختیار کرتے ہیں ان کی روح آسودہ ہوتی ہے اور ان کی شخصیت میں ایسی کشش پیدا ہو جاتی ہے جو دوسروں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اس کے برعکس خود غرضی اور تنگ نظری آدمی کی ذات کو اپنے ہی خول میں بند کر دیتی ہے کہ خود غرضوں کی یہی سزا ہوتی ہے۔

"آیئے..... اس روشنی میں ہم بھی اپنا جائزہ لیں کہ ہمارا شمار کن لوگوں میں ہونا چاہئے۔ بے شک خدا کے نزدیک ہمیں ان لوگوں ہی جیسا ہونا چاہئے جو اس کے عزیز بندے ہیں"۔

آپ کا دوست
ظفر محمود شیخ

بہ خدمت جناب

قارئین کی ڈاک میں اس مرتبہ ہم ایک بحث شروع کر رہے ہیں۔
یہ خط ہمیں آنکھ مچولی کے ایک ساتھی کی جانب سے ملا ہے۔ افسوس کہ انہوں نے اپنا نام لکھنا مناسب نہیں سمجھا، لیکن انہوں نے جو مسئلہ بیان کیا ہے، وہ بہت اہم ہے۔ ہم آپ کو دعوت دیتے ہیں کہ اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیجئے۔ ان سطحات پر آپ کے خطوں کو جگہ دی جائے گی۔

قارئین اس خط کا جواب دیں

محترم ایڈیٹر صاحب!
السلام علیکم

اس خط کو لکھنے کا اصل مقصد آپ کی توجہ ایک مسئلے کی طرف مبذول کرانا ہے وہ یہ کہ، پچھلے ہی دنوں میرے دسویں کے امتحانات ختم ہوئے ہیں۔ ان امتحانات نے میری آنکھیں کھول دیں اور ملک میں ناخواندگی، قابل لوگوں کی کمی اور دیگر بہت سی باتوں کی اصل وجہ بیان کر ڈالی۔ امتحانات میں میرے ساتھ جو ناانصافیاں ہوئیں وہ کچھ اس طرح ہیں۔ ا۔ کچھ سینئروں کو "رحمدل" ممتحن (Examiner) ملے جنہوں نے طلباء و طالبات پر خاص "شفقت" فرمائی اور کھلی چھٹی دے ڈالی اور وہ تمام وقت چیٹنگ کر کر کے اپنا مستقبل "سنوارتے" رہے۔

ہمارے سینٹر کے ممتحن بنیادی طور پر اصولی آدمی تھے ان کا رویہ مجھے بہت پسند آیا۔ میں نے سب خود سے سوچ سوچ کر لکھا مگر غلطی تو پھر ہو ہی جاتی ہے (یہاں غلطی سے مراد نقل قطعاً نہیں ہے) اب آپ ہی فیصلہ کریں کہ میں نے سب خود سے لکھا مگر دوسرے سینٹر کے طلباء نے چیٹنگ کی۔ پرچے دیکھنے والا تو ان کو ہی زیادہ نمبر دے گا یوں ان کو ہر جگہ مجھ پر اور مجھ جیسے کئی پر فوقیت حاصل ہوگی۔ یوں وہ اچھے کالجوں میں چلے جائیں گے جبکہ میں..... ..... ! جب اس قسم کے "چیٹنگ خور" آگے نکلیں گے تو پھر اصل میں غلط بنیاد پڑے گی جو بعد میں نقصان دہ ثابت ہوگی۔ آخر اس مسئلے کا حل کیا ہے؟ میں نے جب اپنے ابو سے پوچھا تو انہوں نے کہا "تمہیں کیا! اپنی محنت کرو!" مگر مجھے اپنی محنت کا ثمر ملتا نظر نہیں آتا۔ ۲۔ ہمارے ملک کے دار الحکومت کے فیڈرل بورڈ کی جانب سے ایک خصوصی سرکیولر (Cercular) جاری ہوا اس میں مختلف مضامین، ہر مضمون کے ہر سبق کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ آیا وہ امتحانی نقطۂ نگاہ سے اہم ہے یا نہیں اور یہ بھی بتایا گیا تھا کہ کسی سبق میں سے کتنے نمبر کا سوال آئے گا۔ اس کو طلبا کی زبان میں (Selective study) بھی کہا جاتا ہے۔ آخر اس کا مقصد کیا ہے کہ آپ خود ہی پرچے سے پہلے اس کے بارے میں اہم باتوں کو منظر عام پر لے آتے ہیں۔ ابو سے بات کی تو انہوں نے کہا "تم پاگل ہو! اپنے کام سے کام رکھو!"

مگر میں کیوں اپنے کام سے کام رکھوں میرا حق سلب کیا جا رہا ہے۔ کیا مجھے سچ بولنے کا حق بھی نہیں؟ ہر کوئی کہتا ہے معاشرہ بدل نہیں سکتا۔ تو کیا میں بدل جاؤں۔ ؟ کیا میں بھی نقل کرنے والا بے ایمان اور آسان رستے سے امتحان پاس کرنے والا بن جاؤں؟ اگر نہیں تو میں کیا کروں؟ آپ میرے سوال کا جواب دے سکتے ہیں کیا؟

ایک محبِ وطن

محمد عظیم، سبّی : آنکھ مچولی پر پرانے لکھنے والوں کا قبضہ ہے جبھی میری تحریریں شائع نہیں ہوتیں۔ ○..... بہت سے پرانے لکھنے والوں کی تحریریں بھی ناقابل اشاعت ہو جاتی ہیں۔ عظمیٰ مجید، لاہور : میں آپ کو اپنی نظم بھیج رہی ہوں، معیار پر پوری اترے تو ضرور شائع کیجئے گا۔ ○..... امید ہے آپ مایوس نہیں ہوں گی اور آئندہ بھی کوشش کرتی رہیں گی۔ اطہر علی ظفر، کراچی : ویڈیو میگزین کا ہمیں شدت سے انتظار ہے، آپ لوگ اس کی پبلسٹی بہت زیادہ کر رہے ہیں۔ ○..... یہ پبلسٹی کا زمانہ ہے۔ ویڈیو میگزین جلد ہی آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔ شیخ اظہر قریشی :(؟) کوئز کہانی کا سلسلہ بند کر کے کوئی نیا معلوماتی سلسلہ شروع کیجئے یا پھر کوئز کہانی ہی میں ذرا مشکل سوالات دے دیا کیجئے اور ہر ماہ اچھے خطوں پر انعام بھی ملنا چاہئے۔ ○..... کوئز کہانی بند کرنے کی کوئی وجہ نہیں..... اچھے خطوں کا جواب ہی انعام ہے۔ شہزاد بشیر، اعظم بستی۔ کراچی : رسالے میں کہانیاں کم ہو گئی ہیں۔ ذہنی آزمائش کے مقابلوں میں جدت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ترجمہ زیادہ سے زیادہ ایک شائع کیا کیجئے۔ ○..... آپ کی شکایتیں اور مشورے شکریہ کے ساتھ نوٹ کر لئے گئے ہیں۔ سلمیٰ ناز، نارتھ ناظم آباد، کراچی : میں نے کوئز کہانی کے جوابات بھیجے تھے۔ میرے خیال

میں تو جوابات درست تھے پھر میرا نام رسالے میں کیوں شائع نہیں ہوا؟ ○ ..... ایسے خط جو مقررہ تاریخ گزرنے کے بعد ملتے ہیں، انہیں شامل نہیں کیا جاتا ہے۔ اس میں قصور محکمہ ڈاک کا بھی ہوتا ہے۔ بشریٰ انیس، اسلام آباد: اپنی تعریف خود کرنا بند کر دیں۔ بخدمت جناب میں مناسب خطوط شائع کریں اور کمانیوں کے ترجموں کو نہ چھاپا کریں۔ ○ ..... بشریٰ بی بی! ہم اپنی تعریف کہاں کرتے ہیں۔ پرچے کی تعریف بھی آپ ہی لوگ خطوں میں کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی تنقید بھی چھپتی ہے، بلکہ اتنی تنقید تو شاید ہی کوئی رسالہ چھاپتا ہو۔ محمد نسیم رفیع، سکھر: ہم کراچی آکر کسی میڈیکل کالج میں داخلہ لینا چاہتے ہیں۔ کیا آپ میڈیکل کالجوں کی فہرست بھیج سکتے ہیں؟ ○ ..... کراچی میں ڈاؤ میڈیکل کالج، سندھ میڈیکل کالج اور بقائی میڈیکل کالج میں سے آپ کسی میں بھی داخلہ لے سکتے ہیں۔ تعارف اللہ خاوری، راولپنڈی: ایک نظم ارسالِ خدمت ہے۔ اسے شائع کر دیجئے۔ ○ ..... آپ کو شاعری میں ابھی اور مشق کی ضرورت ہے۔ عطیہ نواز، شیخوپورہ: انکل! دعا کیجئے ہشتم میں میں اچھے نمبروں سے پاس ہو جاؤں۔ ○ ..... انشاء اللہ آپ ضرور کامیاب ہوں گی، اور ہاں کہانی کے لئے معذرت۔ شیماہ نجم (؟): ایک کہانی بھیج رہی ہوں۔ میری تسلی کے لئے کسی کونے کھدرے میں اس کے لئے جگہ نکال لیجئے گا۔ ○ ..... کہانی بھیجنے کا شکریہ کاش! آپ کی فرمائش ہم پوری کر سکتے۔ بیلا، ترییلہ: موٹاپا ایک خطرناک بیماری ہے۔ اس سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ کم کھایا جائے۔ ہم آپ کی ردی کی نوکری کو مشورہ دیں گے کہ وہ کم کھائے۔ ○ ..... جی ہاں! اس مہینے سے ہماری ردی کی نوکری نے ڈائیٹنگ شروع کر دی ہے۔ محمد فیضان الرب عرف نوید: گزارش یہ ہے کہ رسالے میں آپ ہمارے بزرگان دین کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کیا کریں۔ ○ ..... بہت اچھا مشورہ ہے..... لیکن کیا ہم اس پر عمل نہیں کرتے؟ اسماء حسن (؟): میں پاکستان کے معاملہ میں بہت حساس ہوں اور جب آج کل کے رشوت خود اور بے ایمان لوگوں کو دیکھتی ہوں تو بہت دکھ ہوتا ہے۔ ○ ..... خدا سے دعا کیجئے کہ ان لوگوں کو نیک بنائے! علی اعوان، کراچی: میرا زیادہ تر وقت پڑھائی میں گزرتا ہے اور جو تھوڑا بہت وقت بچتا ہے میں اس میں آنکھ مچولی پڑھنا پسند کرتا ہوں۔ میرے دوستوں کو بھی یہ رسالہ بہت پسند آیا ہے۔ ○ ..... دیکھئے بھئی آنکھ مچولی کی زیادہ تعریفیں نہ کیا کیجئے۔ کچھ ساتھیوں کو ناگوار گزرتا ہے۔ کلثوم کیانی، سکھر: انکل! جلدی سے بتائیں آنکھ مچولی کا خوفناک نمبر کب شائع ہوگا.....؟ پلیز اس سال یہ نمبر ضرور شائع کیجئے گا۔ ○ ..... خوفناک نمبر، دو مرتبہ شائع ہو چکا ہے سید ظفر عباس کاظمی، راولپنڈی: تحریر چھپوانے کے لئے آپ کو کوئی فیس دینی ہوگی؟ ○ ..... ہماری فیس اچھی تحریر ہے اور اس تحریر کی فیس ہم آپ کو چھپنے کے بعد پیش کرتے ہیں۔ محمد بابر اقبال، گلبہار، کراچی: اگر میں آپ کو ہر ماہ ایک مسلم سائنس داں کے بارے میں لکھ کر بھیجوں تو کیا آپ شائع کر دیں گے؟ ○ ..... ضرور بھیجئے، لیکن ذرا محنت سے لکھئے گا تاکہ شائع ہو سکے۔ نصرت جہاں پاکستانی، حیدر آباد: آپ سقوطِ ڈھاکہ کے بارے میں مضامین چھاپئے کیونکہ نئی نسل میں بہت سوں کو اس کے بارے میں بالکل معلومات نہیں ہیں۔ ○ ..... آپ نے بالکل صحیح مشورہ دیا۔ انشاء اللہ عمل کیا جائے گا۔ ہم نے اس موضوع پر بہت سی تحریریں پہلے بھی شائع کی ہیں۔ شاکر اللہ (؟): کیا میرا آنکھ مچولی پر کوئی حق نہیں؟ آپ میری تحریریں کیوں شائع نہیں

کرتے شاید اس لئے کہ ہم گاؤں میں رہتے ہیں۔ ○...... بھئی گاؤں کے رہنے والے تو ہمیں بہت پسند ہیں۔ کیا پرسکون زندگی ہوتی ہے...... لیکن تحریریں...... نہ چھپنے کی وجہ ان کا معیار ہوگا۔

نعیم عزیز، لانڈھی، کراچی...... آپ رسالے میں صرف نمایاں پوزیشن حاصل کرنے والوں کا تعارف دیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آنکھ مچولی پڑھنے والے تمام ساتھیوں کو اپنا تعارف چھپوانے کی اجازت ہونی چاہئے۔ آپ صرف تعارف دیں، تصویر نہ دیں۔ ○...... جی ہاں۔ اب ایسا ہی ہے۔ عائشہ سحر علی، کراچی...... آپ ایک صفحہ چھاپتے ہیں "سنا ہو تو سنائیے دیکھا ہو تو بتائیے"۔ انکل مانا کہ آپ نت نئے مصنوعات پر ہر سال دو خاص نمبر نکالتے ہیں اور ان کے ساتھ خوبصورت تحائف بھی دیتے ہیں، اسی لئے ہم کوئی اور ماہنامہ تلاش بھی نہیں کرتے۔ لیکن میرے خیال میں یہ اپنی بڑائی جتانے اور دوسروں کو نیچا دکھانے کی بات ہے۔ ○...... آپ نے جس صفحے کا ذکر کیا ہے وہ رسالے کا اشتہار ہوتا ہے اور اشتہار میں تو اپنی تعریف ہی ہوتی ہے اس کا مقصد کسی دوسرے رسالے کی توہین نہیں ہوتا۔ عامر یوسف، فیصل آباد...... آپ ایک ایسا سلسلہ شروع کریں جس میں پاکستان کے مختلف میڈیکل کالجوں کی تفصیلی رپورٹ شامل ہو۔ مجھے میڈیکل کالجوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا بہت شوق ہے۔ ○...... آپ کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہے۔ صاحب زادہ احمد منیب بگوی، سرگودھا...... میرا خط آپ نے شاید اس لئے شائع نہیں کیا کہ میں نے تنقید کی تھی کیونکہ سچی بات کڑوی لگتی ہے۔ ○...... آپ بہت زیادہ خفا لگتے ہیں۔ اچھا بھائی خط نہ چھاپنے کی معذرت قبول کیجئے اور غصہ تھوک دیجئے۔ نازیہ صلاح الدین، ٹنڈو جام...... انکل! پہلی بار خط لکھ رہی ہوں۔ خدارا میرے اس معصوم خط کو ردی کی خوفناک ٹوکری سے بچالیجئے، ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گی۔ ○...... آپ کا خط واقعی معصوم ہے، مگر بھئی خط میں کوئی بات بھی تو ہونی چاہئے۔ توقیر سلطان شاہ، اسلام آباد...... آپ کا ماہنامہ پڑھا۔ بہت مزہ آیا۔ ایک کہانی بھیج رہا ہوں ضرور شائع کیجئے گا۔ ○...... شکریہ۔ کہانی اچھی ہے لیکن ابھی کچھ دنوں آپ کو محنت اور مشقت کی ضرورت ہے۔ محمد علی، رشید آباد، کراچی...... آپ کو ہر خط کا جواب دینا چاہئے۔ صرف خط شائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، جاسوس کہانیوں کی تعداد بڑھائیں اور اشتہارات کی بھرمار کم کریں۔ ○...... "کرشمہ" پڑھ کر آپ کا جی نہیں بھرا۔ بھائی! اشتہار تو رسالے کی ریڑھ کی ہڈی ہوتا ہے۔

جن کے خطوط موصول ہوئے۔

(۱) مہرو جاہت حسین سرگانہ، باگڑ سرگانہ (۲) عالیہ فاروق، وہاڑی (۳) شازیہ ناہید، فیصل آباد (۴) فیصل کھنڈی، حیدر آباد (۵) آمنہ طارق، لاہور کینٹ (۶) طیبہ نثار چیمہ، گجرات (۷) ممتاز حبیب، مروان (۸) اعجاز اشرف، کراچی (۹) عبدالعزیز ملک، خیرپور (۱۰) نعیم چوہدری، لاہور (۱۱) محمد جناب امین، لاہور (۱۲) عثمان خلیل (؟) (۱۳) سید وقار حیدر رضوی، وہاڑی (۱۴) ایم اسلم خان، مظفر گڑھ (۱۵) ساجد الرحمٰن، کراچی (۱۶) سید ندیم حمزہ، کراچی (۱۷) سیدہ فرحین گلفام علی زیدی، کراچی (۱۸) عامر اعجاز، گجرات (۱۹) سیف الاسلام، نوشہرہ (۲۰) طارق عزیز، موہارہ (۲۱) علی اصغر سیال اعجاز احمد، نور شاہ (۲۲) رئیس اختر، حیدر آباد (۲۳) محمد عاقل احمد خان، سکھر (۲۴) عرفان احمد راہی، لیاری (۲۵) کرن شاہد، لاہور (۲۶) غلام مصطفےٰ عرف ٹیپو، ماڈل کالونی، کراچی (۲۷) محمد نعیم کیماڑی کراچی (۲۸) خواجہ عماد الدین، گلشن اقبال، کراچی (۲۹) محمد جاوید جنید اویس، نواب شاہ۔

باغ اور آگ

پروفیسر عنایت علی خان

صبح کا سہانا سماں تھا۔ احمد اپنے شاندار محل کے باغ میں انگوروں کی بیل کے سائبان میں بچھے ہوئے مخملیں صوفے پر بیٹھا تھا۔ سائبان سے چند قدم پر سامنے ٹھنڈے میٹھے پانی کا چشمہ بہہ رہا تھا جس کی آواز میں ساز بج رہا تھا۔ پھولوں کے سرسبز و شاداب درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندے بڑی دلکش آوازوں میں چہچہا رہے تھے۔ درختوں کے نیچے دور دور تک سبزے کا قالین بچھا ہوا تھا، جس کے درمیان خوش نما پھولوں کی کیاریاں اپنی بہار دکھا رہی تھیں۔ پھولوں کی خوشبو میں بسے ہوئے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے دل میں عجیب خوشی اور اُمنگ پیدا کر رہے تھے۔

صوفے کے آگے نقشین میز پر سونے چاندی کی جھلمل کرتی طشتریاں رکھی تھیں، جن میں نہایت عمدہ قسم کے پھل چنے ہوئے تھے۔ کچھ کٹے ہوئے اور اکثر ثابت۔ احمد کے ہاتھوں میں سنہری جڑاؤ دستے کی نازک سی چھری تھی جس سے وہ پھل کاٹ کاٹ کر کھا رہا تھا۔ جو پھل کاٹ کر کھاتا وہ پہلے سے زیادہ لذیذ اور خوشبودار ہوتا۔ بڑی میز کے برابر ایک اور چھوٹی سی ہاتھی دانت کی پھولدار میز رکھی ہوئی تھی جس پر پھول دار جگ دھرا تھا، اسی کے نزدیک ایک خوبصورت گلاس بھی شربت سے لبالب بھرا رکھا تھا۔ جگ اور گلاس کی بیرونی سطح پر ٹھنڈک کی وجہ سے ننھے ننھے شبنم جیسے قطرے جم گئے تھے۔ جو ہلکی ہلکی لکیریں

بناتے ہوئے نیچے کی طرف آرہے تھے۔ شربت سے مشک کی خوشبو اٹھ رہی تھی جس سے پوری میز مہک اٹھی تھی۔

احمد نے سامنے رکھی ہوئی طشتری میں سے ایک موتی جیسا انگور اٹھا کر منہ میں رکھا۔ ایسا لگا جیسے کسی نے خوشبو دار گلوکوز منہ میں گھول دیا ہو۔ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا..... سبحان اللہ! ۔ پھر اس نے شربت کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ لیکن ابھی گلاس کی ٹھنڈک ہی کا لطف حاصل کر پایا تھا کہ فضا میں ایک بھیانک چیخ گونجی۔ ہاتھ کی لرزش سے بھرا گلاس چھلک گیا۔ پرندوں کے چہچہے رک گئے۔ چشمے کی آواز کے علاوہ پوری فضا میں پراسرار خاموشی چھا گئی۔

احمد نے گلاس میز پر رکھتے ہوئے حیرت سے چاروں طرف دیکھا لیکن آس پاس تو بس درخت تھے اور ان پر بیٹھے ہوئے رنگ برنگ خوبصورت پرند۔ اُسی کی طرح خاموش اور حیران۔

چند سیکنڈ بعد پھر ویسی ہی چیخ سنائی دی جیسے کوئی گلا پھاڑ کر کسی کو پکار رہا ہو لیکن تکلیف کی شدت سے حلق سے پوری طرح آواز نہ نکل پاتی ہو۔ آواز اس کی بائیں جانب سے آئی تھی، اور ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے اسے پکارا ہو۔

"ا حما آ آد" آواز تیسری بار ابھری جیسے کوئی شدید تکلیف اور مایوسی کی حالت میں اسے مدد کے لئے بلا رہا ہو۔

احمد نے فوراً اپنے بائیں جانب پلٹ کر دیکھا۔ اسے باغ کی دیوار میں لگا ہوا دروازہ کھلا نظر آیا۔ دروازے سے باہر پورا ماحول بھٹی کی طرح سرخ تھا اور آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ دروازے کے بالکل درمیان میں کوئی شخص احمد کی طرف ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا۔ اس کے جسم سے، شعلے اس طرح لپٹے ہوئے تھے جیسے اس نے شعلوں ہی کا لباس پہنا ہو اور سرخ اور زرد شعلوں کے درمیان جسم کی سیاہ کھال بھینس کی بھوری کھال کی مانند لگ رہی تھی۔ سر کے بال جل کر کوئلہ ہو چکے تھے۔ سیاہ چہرے پر دہکتے ہوئے انگاروں جیسی آنکھیں حلقوں سے نکلی پڑتی تھیں۔ منہ سے بالشت بھر باہر لٹکی ہوئی زبان بھی سیاہ تھی۔

احمد اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا تو اس شخص نے بھی اپنا قدم آگے بڑھایا لیکن فوراً ایسا لگا جیسے کسی نے اسے زور سے دھکا دیا ہو۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ پھر اس نے وہیں کھڑے کھڑے اپنی باہر لٹکتی ہوئی زبان کو حرکت دی جس سے وہی بھیانک آواز نکلی۔

"پڑوے، پڑوے پڑو پڑو..... میں پڑویز ہوں۔ تمہارا ساتھی!"

"ہاں ہاں تمہاری شکل میرے کلاس فیلو پرویز سے ملتی جلتی ہے۔" احمد نے اقرار میں سر ہلاتے ہوئے

جیسے اپنے آپ سے کہا۔ پرویز کو سامنے دیکھ کر احمد کے ذہن میں اپنے اسکول کی یادیں اس طرح تازہ ہو گئیں جیسے کوئی فلم چل رہی ہو۔ اس کے سامنے سرخ و سپید چہرے اور خوشبو میں بسا ہوا قیمتی لباس پہننے والا پرویز تھا، وہ پرویز جسے جماعت کے تمام لڑکے رشک اور حسرت سے دیکھتے تھے۔ جسے دولت کے غرور نے اس قدر بے باک بنا دیا تھا کہ لڑکے تو لڑکے استادوں سے بھی بد تمیزی کرتے نہیں چوکتا تھا۔ احمد کو وہ واقعہ بھی یاد آیا جب اس نے ایک بار پرویز سے نماز کے لئے چلنے کو کہا تھا تو پرویز نے مذاق اڑانے کے انداز میں کہا تھا۔ "تم جاؤ، نماز پڑھو اور دعا مانگو۔ میرے پاس سب کچھ موجود ہے مجھے کچھ مانگنے کی ضرورت نہیں، " اور جب احمد نے کہا تھا کہ چلو تمہارے پاس دنیا کی سب نعمتیں موجود سہی نماز پڑھ کر آخرت کی نعمتوں کی دعا مانگ لینا تو اس نے نہایت لاپرواہی سے جواب دیا تھا کہ "چھوڑو یار! آخرت کس نے دیکھی ہے۔ " اس طرح جب ایک محتاج نے اسکول کے راستے میں اللہ کے نام پر پیسے مانگے تھے تو احمد نے تو اسے اٹھنی دے دی تھی مگر پرویز نے جھڑک کر کہا تھا۔ "چل چل جب خدا ہی نے تجھے نہیں دیا تو میں کیوں دوں؟" احمد کو یاد آیا کہ ایک استاد صاحب کے تھپڑ مارنے پر پرویز کا نام اسکول سے خارج کر دیا گیا تھا۔ پھر اسے یاد آیا کہ دس بارہ سال بعد اس نے پرویز کا نام ڈاکوؤں کے سرغنہ کی حیثیت سے اخبار میں پڑھا تھا۔ اس زمانے میں اس کا نام اکثر آیا کرتا تھا کہ پرویز ڈاکو کے گروہ نے فلاں شہر میں ڈاکہ ڈالا اور آج فلاں گاؤں کو لوٹا۔ احمد کے ذہن میں پرویز کی وہ تصویر ابھری جو ڈاکوؤں کے سرغنہ کی حیثیت سے اخبارات میں شائع ہوا کرتی تھی۔ موٹی موٹی خوفناک آنکھیں، تاؤ دی ہوئی مونچھیں، ایک گال پر خنجر سے لگے ہوئے زخم کا نشان...... اس کی نظریں بے اختیار سامنے کھڑے ہوئے پرویز کے چہرے کی طرف اٹھ گئیں۔ آج اس پر رحم آیا لیکن دوسرے ہی لمحے پرویز کے خوفناک چہرے کے ساتھ چھپنے والی وہ تصویریں بھی یاد آگئیں جن میں قتل ہونے والوں کے بوڑھے والدین، بیوائیں اور معصوم بچے روتے ہوئے نظر آتے تھے۔ اس کے دل سے ہمدردی کے سارے خیالات محو ہو گئے اور ان کی جگہ نفرت نے لے لی۔

"پا ا آ آ نی" پرویز کے حلق سے بمشکل نکلنے والی آواز نے احمد کے خیالات کا سلسلہ توڑ دیا۔

"تھ تھ تھوڑا سا پ پ پا اا نی" پرویز نے پھر کہا لیکن احمد کے دل میں اس ظالم کے لئے ہمدردی کا کوئی جذبہ بیدار نہ ہو سکا۔ اس نے حقارت سے پرویز کے بھوت جیسے جسم پر نظر ڈالی اور پلٹ کر واپس جاتے ہوئے کہا۔

"باغ والوں کی غذا آگ والوں پر حرام ہے۔ "

آنکھ مچولی ویڈیو میگزین

اپنے آرڈر سے مطلع کیجئے

- ذہین بچے گلوکار ارشد محمود کے ہم آواز
- رات کی تاریکی میں آگ کے گرد آدم خور قبیلے کا خوفناک رقص
- اطہر شاہ خان جیدی کا تحریر کردہ دلچسپ ڈرامہ "سیکرٹ ایجنٹ ۶½"
- ٹی وی کے مشہور فن کار جمشید انصاری، لطیف مُنّا، خلِ سبحان، نگہت بٹ اور بہت سے آرٹسٹ
- پشاور سے مزے دار خاکوں کا تحفہ
- اسلام آباد، لاہور اور کراچی سے دلچسپ ترین پروگراموں کی ریکارڈنگ کے بعد

آنکھ مچولی ویڈیو میگزین

فروخت کے لیے تیار ہے

اپنے آرڈر سے فوراً مطلع کیجئے

قیمت فی کیسٹ ۱۴۰/۰۰ روپے، مع کوریئر سروس یا ڈاک خرچ

کاروباری حضرات معلومات کے لیے علیحدہ خط لکھیں

آنکھ مچولی ویڈیو میگزین

دفتر آنکھ مچولی

۱- پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

Montgomery
tea time
Montgomery
Montgomery
Montgomery
The Height of Delight!

بیبون

کتنے عجیب تر ہم سے قریب تر

بندروں کی افریقی نسل

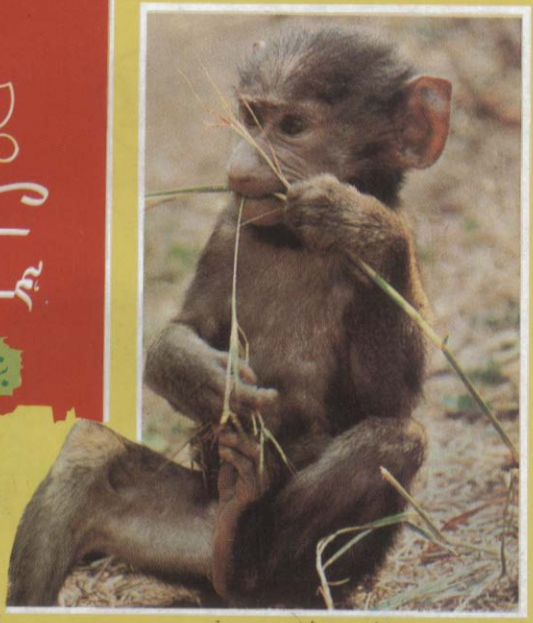

ہم قناعت پسندوں کو کچھ نہیں تو گھاس پھونس ہی سہی

بیبون ماں، شیر خوار بچّہ اور ایک بیبون سہیلی

۵ ماہ کا بیبون بچّہ
کسی ماہر سوار (جوکی) کی طرح ماں کی پیٹھ پر سوار

بیون

بندروں سے قریب تر بندروں کی نسل

سلیم مغل

ڈارون نے کہا تھا کہ انسان، بندر ہی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ ممکن ہے اسے یہ خیال اپنی سنگھار میز کے سامنے بیٹھ کر بال بناتے ہوئے آیا ہو۔ "انسان بندر کی نسل سے تعلق رکھتا ہے۔" ہمیں نہ صرف اس نظریئے سے اختلاف ہے بلکہ ہم اس نظریئے کو پوری انسانیت کی تذلیل سمجھتے ہیں۔ ڈارون اگر یہ کہتا کہ "جانوروں میں بندر کی نسل ہی وہ واحد نسل ہے جو بہت سی حرکتوں میں انسانوں سے قریب تر ہے" تو ہم نہ صرف اس نظریئے کو مان لیتے بلکہ عین ممکن ہے کہ ڈارون کی بندر شناسی پر خوش ہو کر اسے گلے لگا لیتے۔

دنیا بھر میں ماہر حیوانیات بندروں کی مختلف اقسام پر تحقیق کر رہے ہیں۔ ان کے رویّوں پر غور کر رہے ہیں، ان کی عادات اور مزاج کو سمجھ رہے ہیں، انہیں سدھار رہے ہیں اور انہی بندروں سے بڑے بڑے کام لے رہے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ایک بندر یا خلا کا دورہ کر کے بھی آچکی ہے۔ ایک ہم ہیں کہ ابھی تک بندر یا بندریا کا تماشہ دکھانے یا دیکھنے سے آگے نہیں بڑھے۔

بندر کے تماشے سے ہٹ کر اگر ہمارے ہاں بندر کے حوالے سے کچھ ہے بھی تو وہ "بندر بانٹ" یا پھر "بندر گاہ" ہے۔

حد تو یہ ہے کہ ہمیں اب تک یہ بھی پتہ نہیں چل سکا ہے کہ بندر، بوزنہ، لنگور، گوریلا، اور نگاٹون اور بیون میں کیا فرق ہے؟ ہم جسے چاہتے ہیں بندر کہہ دیتے ہیں، جسے چاہتے ہیں "لنگور" نام دے دیتے ہیں۔ گھر میں بچوں پر خفا ہوتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں "کیا بندروں کی سی حرکت کر رہے ہو۔" انہی باتوں پر قیاس کرتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جنگل میں جب بندر کے بچے زیادہ اُودھم مچاتے ہوں گے تو ان کے امی ابو بھی ڈانٹ کر کہہ دیتے ہوں گے، "یہ کیا انسانوں کی سی حرکتیں کر رہے ہو، آرام سے بیٹھ جاؤ۔ تہذیب سیکھو وغیرہ وغیرہ"

بات کہاں سے کہاں جا پہنچی؟ ہم تو آپ سے بندروں کے موضوع پر سنجیدہ گفتگو کرنا چاہتے تھے مگر یہ بندر چیز ہی ایسی ہے کہ اس کا خیال آتے ہی نہ جانے کیوں قلم کو بھی گدگدی سی ہونے لگتی ہے۔

آج ہم بندر کی جس نسل سے متعلق آپ کو کچھ بتائیں گے اسے "ببون" کہتے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ بندروں کی افریقی نسل ہے مگر یہ ایشیائی خطوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ سائنس دان اسے چست و چالاک، ذہین اور سدھایا جانے والا جانور کہتے ہیں۔ قد میں یہ عام بندر سے کچھ بڑا ہوتا ہے۔ رنگت میں بھی کچھ مختلف۔ ببون کا رنگ گہرے سبز رنگ (Olive green) سے قریب تر ہوتا ہے۔ ہم نے اسے پہلی بار سکندرہ میں مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کے مزار پر دیکھا تھا۔ ببون کی بہت بڑی تعداد وہاں بھی موجود ہے۔ مزار پہ جانے والے سیّاح ان بندروں کو اپنے ہاتھ سے مکئی کے دانے موم پھلی یا کھانے کی کوئی اور چیز کھلاتے ہیں اور ببون ان کے ہاتھوں سے یہ ساری اشیا اس طرح لے کر کھاتے ہیں جیسے بچہ ماں کے ہاتھ سے نوالہ لے رہا ہو۔ اکبر کے مزار پر اتنے ببون کیوں ہیں؟ ہم اس نکتے پر غور کرتے کرتے تاریخ کے اس دور میں جا پہنچے جب اکبر اعظم سلطنت ہندوستان کے شہنشاہ تھے۔ بندر یا ببون کو ہم نے روزِ اوّل سے اکبر کے قریب تر پایا۔ اکبر بے چارے تو گزر گئے، ببون اب بھی باقی ہیں۔

اگر آپ ببون کی آنکھوں سے دنیا کو دیکھیں گے تو آپ کو ہر جگہ ببون نظر آئیں گے۔ یہ بات ہم اس لئے کہہ رہے ہیں کہ ببون چونکہ اکثر گروہ یا غول کی شکل میں رہتے ہیں اس لئے ہر وقت ایک دوسرے کے علاوہ کسی کو نہیں دیکھتے۔ ببون کا ایک گروہ عموماً ۳۰ سے لے کر ۱۰۰ ممبرز پر مشتمل ہوتا ہے۔ ببون باہم گفتگو کے لئے اپنا پیغام رسانی کا ایک طریقۂ کار رکھتے ہیں۔ جسم کو چھو کر، چہرے کے تاثرات سے اور غُرا کر یا عجیب و غریب آواز نکال کر اپنا پیغام ایک دوسرے کو پہنچاتے ہیں۔

گروہ میں رہ کر پرورش پانے کی وجہ سے، ببون میں بھی بہت سی انسانی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ ببون بندروں میں پیدا ہونے والا نیا بچہ، انسانی بچے کی طرح سب کی یکساں توجہ کا مرکز بنتا ہے۔ نومولود کے لئے سب سے زیادہ قابل توجہ شخصیت اس کی ماں کی ہوتی ہے۔ اسی طرح فطری طور پر ببون ماں بھی بچے کو پوری توجہ دیتی ہے۔ اس کا خیال رکھتی ہے، اس کی پرورش کرتی ہے اور اسے ہر خطرے سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔ نہ صرف ماں بلکہ ببون شیر خوار کے بہن بھائی بھی اسے پوری توجہ دیتے ہیں، اس کے ساتھ مل کر کھیلتے ہیں۔ اس کے ساتھ بیٹھتے ہیں اور اسے ہر طرح کی تکلیف سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔

تحقیق کرنے والوں کے مشاہدے میں یہ بات بھی آئی ہے کہ ببون بے بی اپنی نانی سے خصوصی تعلق قائم کرتی ہے۔ نانی بھی اپنی نواسی کو بے حد پیار کرتی ہے البتہ یہ رویّہ دادی کے حوالے سے نظر نہیں آتا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ببون بے بی کا اپنے باپ سے کوئی تعلق نہیں

ہوتا بلکہ باپ کون ہے؟ اس کا اسے پتہ بھی نہیں چلتا۔ اپنے خالہ زاد بھائی اور اپنی خالہ وغیرہ سے خصوصی قربت اکثر دیکھنے میں آتی ہے۔ گویا بون بندروں کی نسل میں بھی انسانوں کی طرح رشتوں کا احساس اور احترام باقی ہے۔ انسانوں میں تو یہ احساس شاید کم ہوتا جارہا ہے۔

بون بچہ جیسے جیسے بڑا ہونے لگتا ہے۔ مختلف کھیلوں میں اس کی دلچسپی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ وہ اپنے ہم عمروں میں رہ کر مختلف کھیل کھیلتا ہے۔ ان کھیلوں میں ریسلنگ سے ملتا جلتا کھیل، آنکھ مچولی اور کیچ کیچ کھیلنا خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

بون بچے بڑے نَر بون سے بھی ایسی ہی توجہ پاتے ہیں جیسے ہمارے معاشرے کے بچے اپنے بزرگوں سے، بلکہ مشاہدہ تو یہ بتاتا ہے کہ نَر بون، بچوں سے باپ سا مشفقانہ رویّہ اختیار کرتے ہیں۔ اس کا ہاتھ پکڑتے ہیں۔ اسے پیار کرتے ہیں اور بچے کو پیش آنے والی کسی تکلیف میں اس کے کام آنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بون گروہ کی شکل میں رہتے بھی ہیں اور سفر بھی کرتے ہیں، اس اجتماعی زندگی میں ان کی قربت یا تو بچوں سے رہتی یا پھر مادہ بون سے۔ نَر بون باہم اچھے دوست کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ کسی خطرے کی صورت میں سارے نَر بون مل کر اپنے اجتماعی دفاع کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی تیندوے کے حملے کا خطرہ ہو تو سب سے پہلے تیندوے کو دیکھنے والا نَر بون چیخ کر اپنے گروہ کے بقیہ ارکان کو خبردار کرتا ہے۔ پھر فوراً ہی سارے بون کسی قریبی حفاظتی جگہ کی طرف بھاگ جاتے ہیں۔ بعض اوقات دشمن کو ڈرانے کے لئے بون منہ پھاڑ کر اپنے خنجر نما تیز دانت دکھاتا ہے کہ شاید دانت دکھانے ہی سے خطرہ ٹل جائے۔ گویا بون نفسیات کو سمجھنے والا جانور بھی ہے۔ تقریباً ۳ فٹ قد اور ۵۰ پاؤنڈ وزن رکھنے والا بون اپنے ہم وزن یا بسا اوقات اپنے سے بڑے دشمن کو کامیابی سے خوفزدہ کر کے بھگا دیتا ہے۔ دشمن کے جاتے ہی بون اپنی عمومی سرگرمیوں کی طرف لوٹ آتا ہے۔

ہر روز صبح بون ٹولیوں کی شکل میں تلاش رزق کے لئے نکلتے ہیں۔ اپنے ہاتھ اور پاؤں دونوں پر چلتے ہوئے یہ دور تک نکل جاتے ہیں اور شام ہوتے ہی اپنے ٹھکانوں کی طرف لوٹنے لگتے ہیں۔ دوپہر کے وقت کچھ دیر کے لئے آرام کر لینا بھی ان کی عادات کا حصہ ہے۔ عام طور پر بون گھاس پھوس، سبزیاں، پودے، کیڑے مکوڑے اور کبھی کبھی چھوٹے موٹے جانور بھی شکار کر کے کھا لیتے ہیں۔ رات کے وقت درختوں پر یا پہاڑ کی محفوظ چٹانوں پر آرام کرنا پسند کرتے ہیں۔

ماہرین حیوانیات کے ذریعے حاصل ہونے والی معلومات کا جو حصہ یہاں ہم نے آپ کے مطالعے کے لئے پیش کیا ہے اس میں صرف ایسی باتیں بتائی گئی ہیں جو بون کو اس کے عمل اور

حرکات کے حوالے سے انسان کے قریب تر ثابت کرتی ہیں۔

ماہرین حیوانات اگر ببون یا بندروں کے مشاہدے کے بعد انسانی حرکات کا بغور مشاہدہ کرتے تو یقیناً وہ اس کے علاوہ کسی اور نتیجے پر نہ پہنچتے کہ ببون یا بندر کی نسل کے جانور نسبتاً مہذب بھی ہیں اور دوسروں کو کم سے کم ایذا پہنچانے والے بھی۔

مناسب دام - بہت آرام

آنکھ مچولی

گھر بیٹھے پایئے

86 روپے بچایئے

آنکھ مچولی کے ۱۰ عام اور ۲ خاص شماروں کی سالانہ قیمت مع رجسٹرڈ ڈاک خرچ ۲۳۶ روپے بنتی ہے

مگر

ممبر شپ حاصل کرنے پر ۸۶ روپے کی خصوصی بچت

آپ ہمیں ۱۵۰ روپے کا منی آرڈر روانہ کر دیجئے
ہم آپ کو سال بھر آنکھ مچولی باقاعدگی سے بھجواتے رہیں گے۔

منی آرڈر فارم پر اپنا مفصل نام اور پتہ ضرور لکھئے۔
دیگر ممالک سے زرِ سالانہ کی شرح ۳۰۰/- روپے ہے

منی آرڈر اس پتے پر روانہ کریں

ماہنامہ آنکھ مچولی — ڈی-۱۱۲، سائیٹ کراچی

گاؤں کا بیلا

شبیر بیگ سنان

دریا کنارے گاؤں کا بیلا پھولوں کا مسکن پیڑوں کا
گاؤں کے ریوڑ چرتے ہیں اس میں رنگ زندگی کا بھرتے ہیں اس
چھوٹا سا چشمہ ہے اس کے اندر پانی پیئیں جس سے خرگوش
یہاں چھاؤں چھدری واں ہے گھینری کافی جگہ ہے بیلے نے
بنسی پہ جب گیت چھیڑے گڈریا جھوم اٹھے بیلا، لہرائے
جب لڑکیاں گاؤں کی اس میں آئیں لکڑی جلانے کی وہ لے کے
پھیلائے جس دم سورج سیاہی ستائیں اس میں واماندہ[1]
گھر گھر کے آئیں جب جب گھٹائیں بیلے سے کھیلیں چنچل

گاؤں کا مشرق اِس سے سجا ہے
گاؤں کا منظر اِس سے ہرا ہے

[1] تھکے ہارے۔

طالبانِ
علم وادب کے لئے
گرین گائیڈ اکیڈمی کی شائع کردہ
نادر اور حسین کتابیں اب انتہائی خصوصی رعایت کے ساتھ دستیاب ہیں۔

اس پیشکش کا آج ہی فائدہ اُٹھایئے

یہ کتب آپ کے علمی خزانے میں گرانقدر اضافہ ہوں گی۔

۱ سب سے بڑا انسان ؐ - سیرت طیبہؐ پر سید نظر زیدی کی اہم تصنیف صدارتی ایوارڈ یافتہ۔ ڈی لکس ایڈیشن	موجودہ قیمت مع ڈاک خرچ ۵۰ روپے	بعد از رعایت مع ڈاک خرچ ۳۰ روپے
۲ راہ نما قرآنی حکایات کا دلچسپ مجموعہ	۱۵ روپے	۱۱ روپے
۳ سفر مبارک حجازِ مقدس کا سفرنامہ بھی راہنما بھی	—	صرف ڈاک خرچ ۴ روپے
۴ تعلیم الاسلام ۴ حصوں پر مشتمل۔ اسلام کی بنیادی تعلیمات	—	صرف ڈاک خرچ ۴ روپے
۵ حق اسکواڈ مہماتی کہانیوں کا سنسنی خیز مجموعہ	۱۰ روپے	۸ روپے
۶ کہنا بڑوں کا مانو تعمیر سیرتِ اطفال کے لئے خوبصورت	۶ روپے	۴ روپے

آپ صرف ۶۰ روپے کا منی آرڈر بھجوا کر تمام کتب یکمشت بھی منگوا سکتے ہیں

پتا :- گرین گائیڈ اکیڈمی- ۱۱۲-ڈی سائیٹ کراچی نمبر ۱۶-

عید تماشہ

سلمان غزالی

بھیا بھلکڑ نماز فجر ادا کر کے مسجد سے باہر نکلے تو وہ اپنے ہی خیالوں میں گم تھے۔ انہیں یہ خیال ستا رہا تھا کہ آج بقر عید کے دن بھی عادت کے مطابق اگر وہ کوئی ضروری کام بھول گئے تو بڑی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یوں تو بھیا بھلکڑ کا اصل نام ریاض میاں تھا مگر انہیں بھولنے کی ایسی عادت تھی کہ سب انہیں بھیا بھلکڑ ہی کہتے تھے۔ بھیا بھلکڑ جب اپنے دبے ہوئے مختصر سے جسم پر پاجامہ کرتا پہن کر، سر پر ٹوپی جما کر باہر نکلتے تو دور سے پہچانے جاتے۔ جتنے مختصر اور نازک وہ دیکھنے میں تھے اتنے نازک مزاج بھی تھے۔ وہ اول درجے کے بھلکڑ تھے۔ خود تو وہ اسے خدا کی مرضی سمجھ کہ صابر تھے مگر دادی اماں ان کی امی کو موردِ الزام ٹھہراتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ بچپن میں بھیا بھلکڑ کی نظر اُتارتے وقت ان کی اَمّی سے ایک غلطی ہو گئی تھی اور

دم کئے ہوئے پانی کا لوٹا بھیا بھلکڑ کے سر پر گر گیا تھا جس کی وجہ سے ان کی یاداشت پر بُرا اثر پڑا تھا۔ بھیا بھلکڑ ان باتوں کی پرواہ نہیں کرتے تھے اور سچ تو یہ تھا کہ انہیں دادی اماں کی کہانی یاد ہی نہیں رہتی تھی جو اس کے بارے میں سوچتے۔ آج بھیا بھلکڑ نے پکا ارادہ کیا تھا کہ وہ اپنا کوئی کام نہیں بھولیں گے اور یہی وجہ تھی کہ آج وہ مسجد سے نکلے تو ان کاموں کی لسٹ رَٹ رہے تھے جو ان کو آج کرنے تھے۔ ابھی انہوں نے مسجد کے احاطے سے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ اچانک ان کی نظر سڑک پر پڑی، وہاں ایک آدمی ہاتھ میں ٹوکرا لئے اور دوسرے ہاتھ میں چُھرا پکڑے جا رہا تھا۔ "قصائی" ان کے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔

"اف توبہ عید کی نماز میں صرف تین گھنٹے رہ گئے اور میں نے ابھی تک قصائی کا بندوبست نہیں کیا۔" انہوں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ انہیں یاد تھا کہ پچھلی دفعہ کئی دن پہلے قصائی بُک کرنے کے باوجود قصائی نے قربانی کے وقت کتنا تنگ کیا تھا۔ کتنے چکر لگانے کے باوجود وہ وقت پر نہیں آیا تھا اور پھر آدھے گلے پر چھری پھیرنے کے بعد اس نے بکرے کو چھوڑ دیا اور سو روپے زائد کا مطالبہ کیا۔ اس وقت ابا میاں کو مجبوراً ماننا پڑا ورنہ بکرا تڑپ تڑپ کر ہلاک ہو جاتا اور قربانی نہ ہوتی۔ اس واقعہ کے بعد ابا میاں نے حکم سُنا دیا کہ اگلی دفعہ قصائی کا بندوبست کرنا بھیا بھلکڑ کی ذمہ داری ہے یہ کہ قصائی وقت پر آئے اور معاوضہ بھی پہلے سے طے ہو۔ بھیا بھلکڑ کو ابا میاں پر بڑا غصہ آیا کہ ایک طرف تو وہ کہتے تھے کہ بھیا بھلکڑ گھر کے سب سے سیدھے سادھے بلکہ بُدھو آدمی ہیں اور دوسری طرف ان کے سر پر اتنی بھاری ذمہ داری ڈال دی اور سب سے زیادہ غصہ تو انہیں اس بات پر آرہا تھا کہ ایک سال پہلے یہ کام انہیں دیا گیا اور اب عید آگئی اور کسی نے یاد تک نہیں دلایا۔ انہیں تو ایک دن پہلے کی بات یاد نہ رہتی تھی، بھلا اتنی پرانی بات کیسے یاد رہتی۔ اب جو ان کی نظر قصائی پر پڑی تو انہیں یاد آیا "مجھے اس کو فوراً پکڑ کر بات کر لینی چاہئے" بھیا بھلکڑ نے سوچا اور چھلانگ مار کر نیچے اترے پاؤں زمین پر پڑا تو ایک زور دار چیخ ان کے حلق سے بر آمد ہوئی کوئی چیز بڑی بُری طرح ان کے پاؤں میں چبھی تھی۔ نیچے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ ننگے پاؤں ہیں، جوتی وہ مسجد میں بھول آئے تھے۔ "میں جوتیاں لے آؤں پھر بھاگ کر اسے پکڑ لوں گا۔" بھیا بھلکڑ نے سوچا اور اندر کی طرف لپکے۔ ادھر ادھر دیکھا مگر جوتیاں نہ ملیں، پھر اچانک نظر اپنی جوتیوں پر پڑ گئی "مگر یہ کیا" جوتیوں میں دو عدد پاؤں بھی موجود تھے۔ بھیا بھلکڑ نے گھبرا کر نیچے دیکھا ان کے پاؤں موجود تھے، وہ کسی اور کے پاؤں تھے گویا کوئی ان کی جوتی چوری کر کے لے جا رہا تھا۔ بھیا بھلکڑ نے لپک کر اس آدمی کو پکڑ لیا اور بولے "بھیا یہ میری جوتیاں ہیں۔" موٹے آدمی نے انہیں مڑ کر دیکھا اور بولا "کس نے کہا ہے؟"

"کس نے کہا ہے!"

بھیا سوچ میں پڑ گئے پھر جھنجھلا کر بولے "ارے میاں کہے گا کون یہ ہیں ہی میری جوتیاں" ۔

"آپ کے پاس کیا ثبوت ہے؟" موٹا آدمی انہیں گھورتا ہوا بولا" ۔

"ارے میاں! میں پہچانتا ہوں میں نے خود اسٹور سے ننانوے روپے ننانوے پیسے میں خریدی تھی۔" بھیا بھلکڑ کو اب غصہ آگیا تھا۔

"تو کیا کوئی اور آدمی ننانوے روپے ننانوے پیسے کی جوتی نہیں خرید سکتا؟" موٹا آدمی تیز لہجے میں بولا۔

ایک تو بھیا کو ویسے ہی جلدی تھی اور دوسری طرف یہ۔ ان کے غصے کی انتہا نہ رہی بھیا بھلکڑ نے اس کا گریبان پکڑ لیا "میں کہتا ہوں میری جوتی دے دو ورنہ....." بھیا غصے سے بُری طرح کانپنے لگے تھے۔ پتا نہیں وہ شخص بھیا کی دھمکی سے ڈر گیا تھا یا بھیا بھلکڑ کے کانپنے سے کہ اس نے جوتیاں اتار دیں اور بڑبڑاتا ہوا چل دیا، "عجیب لوگ ہیں پہلے خود ہی جوتیاں چھوڑ جاتے ہیں اور پھر جب کوئی غریب پہن لے تو واپسی کے لئے شور مچاتے ہیں۔"

بھیا نے جلدی سے جوتیاں پہنیں اور مسجد سے نکل کر اس چوراہے کی طرف بھاگے جہاں انہوں نے قصائی کو جاتے دیکھا تھا۔ چوراہے پر پہنچ کر وہ چکرا کر رہ گئے، سڑکیں سنسان پڑی تھیں قصائی کہیں نظر نہیں آرہا تھا ابھی وہ ادھر ادھر دیکھ ہی رہے تھے کہ اچانک ان کی نظر اسٹریٹ لائٹ کے نیچے پڑی تو وہاں ایک گٹھری سی پڑی نظر آئی، غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ کوئی نشہ کا عادی گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا تھا۔ بھیا بھلکڑ لپک کر اس کے پاس پہنچے اور بولے "بھیا آپ نے کوئی لمبے قد کا پتلا دبلا سا آدمی تو ادھر سے گزرتے نہیں دیکھا ہے، گورا رنگ ہاتھ میں ٹوکرا اور چھری پکڑے ہوئے" ۔ وہ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر اشارے سے بولا "ادھر گیا ہے" ۔ اور سگریٹ منہ میں دبا کہ دوبارہ سجدے کی حالت میں چلا گیا۔ بھیا بھلکڑ اشارہ ملتے ہی اس طرف بھاگ کھڑے ہوئے وہ قصائی کو فوراً پکڑ لینا چاہتے تھے۔ ابھی وہ تھوڑی دور ہی گئے ہوں گے کہ سامنے ایک بچہ نظر آیا۔ اس نے ایک گھر کی گھنٹی بجائی اور بھاگ گیا۔ بھیا بھلکڑ نے توجہ نہیں کی اور بھاگتے رہے مگر ابھی وہ ذرا آگے نکلے ہی تھے کہ پیچھے سے ایک عورت کی آواز آئی "ارے میاں! پکڑنا یہی ہے جو روزانہ ہماری گھنٹی بجا کر بھاگ جاتا ہے" ۔ یہ سن کر بھیا بھلکڑ کے تو پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ انہوں نے اور تیز بھاگنا شروع کر دیا، مگر تھوڑی ہی دیر میں ایک تگڑے سے آدمی نے انہیں گردن سے پکڑ لیا" اچھا تو یہ تم ہو جو روزانہ گھنٹی بجا کر بھاگ جاتے ہو" ۔

"ارے نہیں بھائی! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے" بھیا بھلکڑ کی تو اس موٹے تازے آدمی کو

دیکھ کر ہی جان نکلی جارہی تھی۔

"اچھا تو تم نے کبھی گھنٹی نہیں بجائی؟" اس نے بھیا بھلکڑ کو ایک زور دار جھٹکا دیا۔

ایک دفعہ بجائی تھی بھیا بھلکڑ منمنائے۔ "وہ بھی بچوں کی ضد تھی کہ بیل کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹی بجائیں تب بیل نے اتنی زور سے ٹکر ماری تھی کہ اس کے بعد سے میں گھنٹی بجانا ہی بھول گیا"۔ بھیا نے بمشکل بات ختم کی۔

"مجھے بیوقوف بناتا ہے"۔

اس آدمی نے ایک زور دار تھپڑ رسید کیا اور بھیا بھلکڑ منہ کے بل زمین پر آرہے۔ بھیا بھلکڑ جیسے کمزور آدمی کے لئے اس نے اتنی سزا ہی کافی سمجھی اور واپس چل دیا۔ بھیا بھلکڑ بھی جان بچا کر بھاگے۔ مگر اب بھی ان پر قصائی کو تلاش کرنے کی دھن سوار تھی۔ سڑک پر بے عزت ہونے کی انہیں ذرا پرواہ نہ تھی اصل پریشانی یہ تھی کہ گھر میں بے عزت نہ ہونا پڑے۔ تو بھیا بھلکڑ تھک ہار کر واپس چل دیئے۔ وہ اینچی جس نے قصائی کا پتا بتایا تھا اب بھی وہیں بیٹھا تھا بھیا بھلکڑ کو دیکھ کر بولا، "آپ نے دبلے پتلے لمبے قد کے گورے سے آدمی کا پوچھا تھا نا" بھیا نے سر اثبات میں ہلا دیا۔ اینچی بولا معاف کرنا بھائی میں نے غلط بتا دیا تھا۔ وہ آدمی اس طرف نہیں دوسری طرف گیا تھا۔" بھیا بھلکڑ کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور دل چاہا کہ اس کا گلا دبا دیں مگر وہ رکے نہیں اور تیز تیز قدموں سے دوسری طرف چل دیئے۔ بھیا بھلکڑ ہر گلی میں جھانکتے جارہے تھے۔ ایک گلی میں دیکھا تو خوشی کے مارے ان کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ قصائی چلا جارہا تھا، بس پھر کیا تھا بھیا بھلکڑ نے جھٹ جوتیاں اتار کر ہاتھ میں پکڑیں، کمر بند زور سے کسا اور قصائی کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیا۔ بھیا بھلکڑ کو جب بھی بھاگنا پڑتا احتیاطاً کمر بند اچھی طرح کس لیتے تھے..... قصائی اب ایک اور گلی میں مڑ چکا تھا۔ بھیا کا ماتھا ٹھنکا۔ یہ تو وہی گلی ہے جس کے کتے سارے محلے میں مشہور تھے۔ ایک دفعہ بھیا بھلکڑ صبح صبح چہل قدمی کرتے ہوئے ادھر نکل آئے تھے۔ اور کتے ان کے پیچھے لگ گئے تھے بھیا بھلکڑ نے بڑی مشکل سے جان بچائی تھی مگر پھر بھی ایک کتے نے کاٹ ہی لیا تھا وہ تو خیر ہوئی کہ کتے کے دانت ان کے پاجامے میں پھنس گئے اور ٹانگ بچ گئی۔ بھیا بھلکڑ کتے کی شکایت لے کر اس کے مالک کے پاس پہنچے تو اس نے الٹا انہیں ڈانٹ دیا اور بولا "صبح صبح اپنے کتے کے دانت صاف کروائے تھے اور تمہارے غلیظ پاجامے میں پھنس کر سارے گندے ہوگئے"۔ اسی لئے کتوں کے خیال سے بھیا نے مڑتے وقت ایک بڑا سا پتھر اٹھا لیا۔ قصائی بڑے آرام سے ٹہلتے ہوئے جارہا تھا۔ اب جو اس نے بھیا بھلکڑ کو ایک ہاتھ میں جوتیاں پکڑے اور دوسرے ہاتھ میں پتھر پکڑے اپنی طرف بھاگتے دیکھا تو وہ بھی سر پر پیر رکھ کر بھاگا۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد رک گیا اور جیسے ہی بھیا بھلکڑ اس کے پاس پہنچے

اس نے بھیا بھلکڑ کو پکڑ کر اڑ نگا مار کر زمین پر گرا دیا۔ قصائی کے ہاتھ میں چھرا تھا بھیا کی آواز حلق میں ہی اٹک کر رہ گئی۔ بڑی مشکل سے بولے "ارے بھائی میں تو تم سے قربانی کروانا چاہتا ہوں"

"قربانی کے لئے..... اتنی جلدی؟" وہ بھیا بھلکڑ کو چھوڑتا ہوا حیرت سے بولا۔

"شاید دیر ہو جانے کی وجہ سے یہ میرا مذاق اڑا رہا ہے۔" بھیا نے سوچا "مگر مجھے اس کو منا لینا چاہئے۔" یہ سوچ کر بھیا بھلکڑ نے فوراً جھک کے عرض کیا "پلیز وعدہ کریں کہ آپ ضرور آئیں گے"۔ بھیا بھلکڑ نے عاجزی میں سر جھکایا تو ان کی ٹوپی قصائی کے قدموں میں گر گئی۔ وہ بے چارہ پتا نہیں کیا سمجھا فوراً بولا "اچھا اچھا ٹھیک ہے۔" بھیا بھلکڑ نے اسے اپنا پتا سمجھایا اور تاکید کی کہ ٹھیک دس بجے آجانا۔

بھیا بھلکڑ گھر پہنچے تو بڑے خوش تھے تکلیف تو انہوں نے بہت اٹھائی تھی مگر انہیں خوشی تھی کہ انہوں نے اپنی ذمہ داری خوش اسلوبی سے نبھا دی تھی۔

بھیا بھلکڑ گھر پہنچے تو بڑے خوش تھے وہ ابا میاں کے کمرے میں پہنچے اور خوش خوش بولے آپ نے تو مجھے یاد تو نہیں دلایا مگر میں نے پھر بھی بندوبست کر لیا ہے"۔

"بندوبست کس چیز کا بندوبست؟" ابا میاں حیرت سے بولے "یہی قصائی کا ٹھیک دس بجے قربانی کرنے آجائے گا۔" بھیا بھلکڑ بڑے فخر سے بولے۔ پہلے تو سب انہیں حیرت سے دیکھتے رہے مگر پھر جو سب پر ہنسی کا دورہ پڑا تو نہ پوچھئے۔ بھیا بھلکڑ کو، بڑا غصہ آیا بولے "بھلا اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے" چھوٹا بھائی بولا "بھیا بھولتے تو آپ پہلے بھی تھے مگر اس دفعہ تو آپ نے حد کر دی" "کیا مطلب؟" بھیا بھلکڑ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا "کیا آج عید نہیں ہے؟"

"جی نہیں عید تو ہے مگر عید الاضحیٰ نہیں بلکہ عید الفطر ہے۔" بھیا بھلکڑ حیرت کی تصویر بنے اپنے کمرے میں آگئے۔ شرمندہ تو بھیا بھلکڑ بہت ہوئے مگر وہ مطمئن تھے اچھا ہی کیا کہ انہوں نے قصائی کی بکنگ کر لی۔ معلوم نہیں اگلی عید تک قصائی ہاتھ بھی آتا ہے یا نہیں۔ لوگ بے شک عید سے بہت پہلے قصائی کی بکنگ کر لیتے ہوں گے مگر بھیا بھلکڑ نے جتنے پہلے بکنگ کی شاید ہی کبھی کسی نے کی ہوگی۔

اسے پلو سے باندھ لیجئے

اپنی تحریر بھجواتے ہوئے یا ہمیں خط لکھتے ہوئے اپنا پتہ لفافے کی پشت پر لکھنے کو کافی نہ سمجھئے۔ اپنے ہر خط اور اپنی ہر تحریر کے پیچھے اپنا نام اور مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

ادارہ آنکھ مچولی

لکھنا اوٹ پٹانگ کہانی کا

نائلہ صدیقی

گیڈر کی شامت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے ہماری جو شامت آئی تو ہم ایک عدد معاشرتی اور سبق آموز کہانی لکھنے بیٹھ گئے۔ ہمیں یہ چیلنج دیا گیا ہے کہ ہم کوئی سبق آموز اور پیغاماتی کہانی نہیں لکھ سکتے، صرف اوٹ پٹانگ، بے سروپا مضامین لکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ اس چیلنج کے جواب میں ہم ایک معاشرتی کہانی لکھنے میں جی جان سے جُتے ہوئے ہیں اور بہت سی معاشرتی و سبق آموز کہانیوں کے خاکے ہمارے ذہن میں گردش کر رہے ہیں۔

معاشرتی اور سبق آموز کہانیاں بالعموم مکافاتِ عمل پر مبنی ہوتی ہیں، اس سلسلے میں منشیات کی کہانیاں بڑی مقبول ہیں۔ اس کہانی میں ہوتا یہ ہے کہ منشیات کا ایک بہت بڑا اسمگلر ہوتا ہے، وہ اپنے وطن

کے نوجوانوں کو نشے کے ذریعے تباہ کرتا رہتا ہے، منشیات پھیلاتا رہتا ہے۔ منشیات پھیلاتے پھیلاتے جب وہ گھر پہنچتا ہے تو اسے اچانک پتہ چلتا ہے کہ اس کا اپنا بیٹا منشی یعنی منشیات کا عادی ہو گیا ہے۔ بس یہی کہانی کا عروج و زوال ہوتا ہے یعنی کہانی ختم ہو جاتی ہے۔ اچھے مصنفین اس موقع پر منشیات فروش کی آنکھوں سے دو آنسو بھی نکال دیتے ہیں تاکہ قارئین سمجھ جائیں کہ یہ پچھتا رہا ہے۔ اس کہانی کو مزید اثر انگیز اس طرح بنایا جاسکتا ہے کہ "ایک تھا منشیات کا اسمگلر! ایک دن جب وہ منشیات بیچ کر گھر پہنچتا ہے تو اس کا اکلوتا بیٹا اسے نوچنے کھسوٹنے اور بھنبھوڑنے لگتا ہے۔ ارے یہ کیا کر رہا ہے؟ اسمگلر چیخ اٹھا" آپ منشیات بیچتے ہیں ناں اس لئے آپ کا بیٹا منشی یعنی منشیات کا عادی ہو گیا ہے، یہ عمل مکافات ہے۔ "بیوی رو کر بولی۔ "تو یہ مجھے کیوں نوچ کھسوٹ رہا ہے؟ منشی تو اپنے آپ کو نوچتے کاٹتے ہیں۔" اسمگلر دھاڑا۔

"اس لئے ڈیڈی! کہ منشیات آپ بیچتے ہیں اس لئے تھوڑی سزا آپ کو بھی ملنی چاہئے تاکہ آپ کو بھی مزہ آئے منشیات بیچنے کا!" بیٹے نے ہنس کر کہا۔ "مم مجھے معاف کر دو بیٹا!" اسمگلر چیخ اٹھا مگر اب وقت گزر چکا تھا۔ دیکھا بچو! منشیات بیچنے کا انجام! واہ کیسی شاندار معاشرتی کہانی تخلیق ہوئی ہے، ذرا یہ جملہ تو اندر لائن کر دوں، دیکھا بچو والا! تاکہ بچے سمجھ جائیں کہ یہاں سے سبق شروع ہو گیا ہے۔

تخریب کاری! یہ بھی سبق آموز معاشرتی کہانیوں کا مقبول موضوع ہے۔ اس میں ایک تخریب کار وطن دشمن عناصر سے لاکھوں روپے وصول کر کے اپنے وطن میں تباہی و بربادی پھیلاتا رہتا ہے۔ ایک روز وہ کلفٹن / صدر (اس ضمن میں مصنف جس شہر میں رہتا ہے اس شہر کے مشہور مقام کا نام لکھا جاتا ہے) بم رکھ دیتا ہے پھر لاکھوں روپے بوری میں بھر کے سر پر رکھ کر ہنسی خوشی گھر لوٹتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے بچے تو کلفٹن کی سیر کے لئے گئے ہوئے ہیں۔ وہ چیخ پڑتا ہے، نوٹوں کو آگ لگا دیتا ہے۔ بیوی کو ڈانٹتا ہے کہ وہ کلفٹن کیوں نہیں گئی؟ اس موقع پر اگر مصنف قارئین کو بہت کھول کھول کر سبق سمجھانا چاہئے تو وہ "ضمیر" کو تخریب کار کے سامنے لے آتا ہے جو تخریب کار اور قارئین دونوں کو یہ بتاتا ہے کہ وہ جو دوسروں کے لئے گڑھا کھودتا ہے خود ہی اس میں گر جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی سبق ختم اور کہانی بھی ختم۔

ایک اور سبق آموز کہانی، لکھنے والوں میں بہت مقبول ہے جو ہر ماہ ہر رسالے میں شائع ہوتی ہے وہ کہانی اس قسم کی ہوتی ہے کہ ایک بہت مشہور اور بہت بے رحم ڈاکٹر ہوتا ہے جو ہزاروں روپے فیس لیتا ہے، اوہو آپ سمجھ گئے! بھئی جو قارئین چار پانچ رسالے پڑھ چکا ہے وہ اس کہانی کو بہت اچھی طرح سمجھ چکا ہے۔ بہرحال ہمیں تو سبق آموز کہانی سے غرض ہے، قارئین سمجھتے ہیں تو سمجھتے رہیں۔ اب آپ یہ تو سمجھ

ہی گئے ہوں گے کہ اسی دن ڈاکٹر کا اکلوتا بیٹا روڈ ایکسیڈنٹ میں زخمی ہو جائے گا (ایسی کہانیوں میں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ادھر ڈاکٹر باپ نے ہزاروں روپے فیس لی ادھر شہر کی تمام گاڑیاں اس کے اکلوتے بیٹے پر چڑھ دوڑیں، بہرحال سبق تو یہیں سے شروع ہوتا ہے اس لئے یہ منظر دکھانا ناگزیر ہے) ۔ اب چند راہ گیر زخمی بیٹے کو لے کر اس کے کلینک آئیں گے وہ ہزاروں روپے فیس طلب کرے گا۔ راہ گیر فیس دینے سے معذوری ظاہر کریں گے۔ (راہ گیروں کو معلوم ہے کہ یہ مکافات عمل ہے لہٰذا وہ کیوں ہزاروں روپے خرچ کریں) ڈاکٹر زخمی کو دیکھنے سے انکار کر دے گا، آخر کوئی نامعلوم طاقت (یعنی مصنف) اسے کھینچ کر آپریشن تھیٹر لے جائے گی جہاں اس کا اپنا بیٹا زخمی پڑا ہو گا۔ بعض بے درد مصنفین اس موقع پر اثر انگیزی پیدا کرنے کے لئے بیٹے کو مار بھی دیتے ہیں (کیونکہ وہ ڈاکٹر کا بیٹا ہے مصنف کا نہیں) یہیں پر کہانی بھی مر جاتی ہے یعنی ختم ہو جاتی ہے۔ اب اگر قارئین یہ کہیں کہ یہ کہانی تو شروع ہی سے مری ہوئی تھی تو ہم کیا کر سکیں؟ ہمیں تو سبق دینا مقصود ہے۔ کچھ جدت پسند منصفین اس کہانی میں ایکسیڈنٹ کے بجائے اسٹرائیک دکھانا پسند کرتے ہیں۔ اس سے کہانی میں ذرا انفرادیت پیدا ہو جاتی ہے لیکن یہ انفرادیت صرف پہلی کہانی تک محدود رہتی ہے پھر بار بار اسٹرائیک اور بار بار بیٹے کے مرنے سے بوریت پیدا ہو جاتی ہے۔ خیر اس کہانی کا مختصر خاکہ یوں ہوتا ہے کہ ڈاکٹر اپنے مطالبات منوانے کے لئے ہڑتال کر دیتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں وہ کسی مریض اور کسی بیٹے کو نہیں دیکھیں گے، بقیہ کہانی وہی ہوتی ہے یعنی زخمی بیٹے کی آمد، ڈاکٹر کا انکار آخر کار بیٹے کی وفات اور عمل مکافات۔

لیجئے! تین چار شاندار قسم کی معاشرتی کہانیوں کا خاکہ تیار ہو گیا۔ ہم نے تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ چاروں کہانیاں تیار کر کے چار مختلف رسالوں میں بھیج دیں۔ ہمیں امید تھی کہ ہماری چاروں کہانیاں پورے اعزاز کے ساتھ ہر رسالے کے اولین صفحات میں شائع ہوں گی۔ ہم بے چینی سے اپنی سبق آموز معاشرتی کہانی شائع ہونے کے منتظر تھے کہ ایک رسالے کے ایڈیٹر کی طرف سے ہمیں یہ خط موصول ہوا

"محترمہ مصنفہ صاحبہ!

السلام علیکم

آپ کی معاشرتی اور سبق آموز کہانی موصول ہوئی۔ ہم معذرت کے ساتھ آپ کو یہ اطلاع دے رہے ہیں کہ یہ کہانی ناقابل اشاعت ہے۔ ناقابل اشاعت ہونے کی دو وجوہ ہیں اول یہ کہ موضوع بہت پرانا ہے اور اس قسم کی کہانیاں بار بار شائع کرنے سے ہمارے قارئین کو صرف یہ سبق ملے گا کہ ہمارا رسالہ پڑھنا بند کر دیں۔ دوسرے ہم اس قسم کی کہانیاں شائع کر کے اپنے قاری کو اداس، پریشان اور

مضمحل نہیں کر سکتے کیونکہ ہمارا قاری ایک عام آدمی ہے، جو اسی معاشرے میں رہتا اور دن رات لاقانونیت، تخریب کاری، دہشت گردی، رشوت ستانی جیسے معاشرتی مسائل سے دوچار رہتا ہے اور ہم نہیں چاہتے کہ جب وہ ان مسائل سے وقتی طور پر نجات حاصل کرنے کے لئے ہمارا رسالہ پڑھے تو بجائے تفریح حاصل کرنے کے مزید بیزار ہو جائے۔ ایک تھکے ہارے پریشان حال شخص کو خوشی، سکون اور تفریح کے چند لمحات فراہم کرنا کیا نیکی نہیں؟ اگر آپ ہمارے خیال سے متفق ہیں تو فوراً ایک عدد ہنستا مسکراتا مضمون روانہ کر دیجئے!"

والسلام ایڈیٹر

اور قارئین! آج کل ہم ایک اوٹ پٹانگ مضمون لکھنے میں مصروف ہیں لیکن سچ سچ بتایئے کہیں یہ مضمون بھی تو اوٹ پٹانگ نہیں ہو گیا۔

سر پھوڑنا ٹھہرا ہے تو اینٹوں ہی سے پھوڑیں

عجیب و غریب ٹانگ

خالد خلیل

سارہ جب پیدا ہوئی تھی تو اس وقت اس کی ایک ٹانگ تو صحیح سلامت تھی جبکہ دوسری ٹانگ نامکمل تھی۔ یہ نامکمل ٹانگ، مکمل طور پر مفلوج تھی۔ چھوٹی عمر میں تو اس نامکمل ٹانگ نے سارہ اور اس کے والدین کے لئے کوئی خاص مشکل پیدا نہیں کی لیکن جب سارہ چلنے کے قابل ہوئی تو ایک ٹانگ نہ ہونے کی وجہ سے اسے چلنے میں مشکل ہونے لگی۔ سارہ کے والدین کو یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ تب انہوں نے سارہ کو OKLAHOMA شہر کے ایک ماہر سرجن JOHN SABOLICH کو دکھایا۔

JOHN SABOLICH صاحب نے اس وقت تو ایک مصنوعی ٹانگ سارہ کی نامکمل ٹانگ کے ساتھ فٹ کر دی لیکن جب سارہ چار سال کی عمر تک پہنچنے کے بعد دوڑنے کے قابل ہوئی تو اس نے JOHN سے درخواست کی کہ وہ بھی اور دوسرے بچوں کی طرح دوڑنا اور کھیلنا چاہتی ہے۔ یہ بات اس وقت ناممکن تھی کیونکہ اس وقت تک کوئی ایسی جدید مصنوعی ٹانگ نہ تھی جس کی مدد سے سارہ دوڑ سکتی یا کھیلوں میں حصہ لے سکتی، مگر سارہ کی اس درخواست نے JOHN SABOLICH کو ایک نئی راہ دکھائی۔ انہوں نے ایک ایسی مصنوعی ٹانگ کی تیاری شروع کر دی جو سارہ اور سارہ جیسے دوسرے بچوں کو کھیلنے اور دوڑنے میں مدد دے سکے۔ ان کی محنت اور تحقیق رائیگاں نہیں گئی اور وہ ایک ایسی الیکٹرانک ٹانگ بنانے میں کامیاب ہو گئے جو بٹن کے دبانے سے تیزی سے حرکت کرنا شروع کر دیتی ہے۔

بیٹری کی مدد سے چلنے والی یہ مصنوعی ٹانگ سارہ کی مفلوج ٹانگ کی جگہ نصب کر دی گئی ہے۔ اب سارہ دوڑ سکتی ہے، کھیل سکتی ہے اور موٹر سائیکل کی سواری کر سکتی ہے۔

حوالہ ..... نیشنل جیوگرافک ورلڈ۔ اگست ۱۹۹۱ء

عجیب و غریب ٹانگ

تحقیق کا کمال بیٹری سے چلنے والی ٹانگ

اک ٹانگ ہے تحقیق کا محور میرے آگے

بھاگتی پھرتی ہوں
مَیں اس ٹانگ سے
—— سارہ

ٹانگ بن بھی گئی اور لگ بھی گئی

جہاں اُداسی نہیں ہوتی

تحریر: ایل ایم منٹگمری
تلخیص و ترجمہ: طارق محمود مینیاں

اگست کی جھلستی ہوئی سہ پہر تھی۔

این باہر بیٹھی میتھیو۔ کے ساتھ گپ شپ کر رہی تھی اور میریلا گھر کے اندر جل بھن رہی تھی کہ این نے اب بہت کھیل لیا اور باتیں بھی کر لیں۔ اب اسے چاہئے کہ اندر آ کے کچھ سلائی کڑھائی بھی کر لے۔ لیکن یوں لگتا تھا کہ جتنی ہی وہ اوٹ پٹانگ باتیں کرتی ہے اتنا ہی بوڑھا میتھیو محظوظ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی باتیں کبھی ختم ہونے میں نہیں آتیں۔

"این شرلے! فوراً اندر آؤ ..... سنا تم نے!" تنگ آکر میریلا چیخی تو این فوراً اندر بھاگ آئی۔

"اوہ میری پیاری پیاری میریلا! کیا آپ کو معلوم ہے کہ اگلے اتوار کو مسٹر ہارمن اینڈریوز کے فارم پر ہمارا اسکول پکنک منانے جا رہا ہے..... چمکتے ہوئے پانی والی جھیل کے کنارے..... اور وہاں مسز بیگل اور مسز الیشل کا آئس کریم بنانے کا بھی پروگرام ہے..... پیاری اور اچھی میریلا کیا میں بھی پکنک پر چلی جاؤں؟" این نے امید بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھو تم کہنا ماننا سیکھو اور جب کبھی میں اندر آنے کو کہوں تو فوراً آیا کرو نہ کہ آدھ گھنٹہ دیر سے..... اور راستے میں گیمیں لگانا بھی چھوڑ دو..... اب جہاں تک پکنک پر جانے کا سوال ہے تو جب تمہارے اسکول کی باقی لڑکیاں جارہی ہیں تو تمہارا نہ جانا درست نہیں تم جاسکتی ہو۔"

"لیکن لیکن..... ڈائنا نے کہا ہے کہ ہر کسی کو اپنے ساتھ کھانے کو بھی کچھ نہ کچھ لے جانا ہوگا۔ میں اگر کچھ نہ لے گئی تو بڑی شرمندگی ہوگی۔"

"تم فکر نہ کرو۔ میں تمہارے لئے کچھ نہ کچھ پیک کر دوں گی۔"

"اوہ میری پیاری میریلا..... آپ کتنی اچھی ہیں۔ اوہ آپ کا شکریہ میں کیسے ادا کروں۔"

اس طرح اوہ اوہ کرتی ہوئی این، میریلا کے بازوؤں میں گھس گئی اور بار بار تیزی سے اس کے پھولے ہوئے رخساروں پر پیار کرنے لگی۔

این، میریلا اور میتھیو کی لے پالک بیٹی تھی۔ ان کے اپنے کوئی اولاد نہیں تھی اور جب سے این ان کی زندگی میں آئی تھی ایک نئی طرح کی خوشیوں نے ان کے گھر میں قدم رکھ دیا تھا..... اور آج میریلا کی زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ کسی کے ننھے ننھے ہونٹوں نے بے اختیارانہ طور پر اس کے چہرے کو چھوا تھا۔ این کے بے تابانہ پیار نے اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑا دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ایکدم بولی..... "بس بس اب اسے بند کرو اور اپنا پیچ ورک مکمل کرو۔ پھر چائے کا وقت ہو جائے گا۔"

"مجھے پیچ ورک بالکل پسند نہیں ہے۔" این نے ورک باسکٹ کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا..... "اس سے تو سلائی ہی اچھی ہوتی ہے۔ پیچ ورک میں تو بس ایک کے بعد ایک ٹانکا لگاتے جاؤ اور بس۔ یہ بور کام کرتے وقت تو میں یہی سوچتی ہوں کہ وقت تیزی سے گزر جائے۔ بالکل ایسے ہی جیسے ڈائنا کے ساتھ کھیلتے ہوئے پر لگا کر اڑ جاتا ہے..... میریلا! آپ کو تو پتہ ہے ناں کہ ہمارے اور مسٹر بیری کے فارم کے درمیان میں زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے۔ یہ ٹکڑا مسٹر ولیم بیل کی ملکیت ہے اور اس کے ایک کونے میں سفید پھول والے درختوں کا ایک جھنڈ ہے..... بہت ہی پیاری اور افسانوی جگہ..... ہم نے اس جگہ کو "آئیڈل وائلڈ" کا نام دیا ہے مجھے یہ نام سوچنے میں بڑا وقت لگا تھا۔ رات بھر جاگتی رہی تھی اور پھر کہیں صبح کے وقت جا کے اچانک یہ نام ذہن میں آیا تھا۔ ڈائنا تو یہ نام سنتے ہی پاگل ہو گئی تھی..... ہم نے وہاں بڑے اہتمام اور بڑے سلیقے کے ساتھ اپنا کھیلنے کا گھر بنایا ہوا ہے۔ آپ کبھی آ کے دیکھیں..... وہاں بڑے بڑے پتھر ہیں جن پر صاف ستھری کائی جمی ہے..... بیٹھنے کی جگہ سے لے کر ادھر ادھر ہر جگہ درخت در درخت..... اور ہم نے ان پر اپنی تھالیاں سجا رکھی ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ ٹوٹی پھوٹی ہیں لیکن ہم

خیالوں میں انہیں صحیح سلامت سمجھ لیتے ہیں۔ انہی میں سے ایک سرخ اور پیلے رنگ کی بڑی ہی خوبصورت پلیٹ ہے جسے ہم بناؤ سنگھار والی جگہ میں رکھتے ہیں..... اور ہمارے پاس ایک طلسماتی شیشہ بھی ہے۔ ڈائنا کو یہ اپنے گھر کے پچھواڑے ملا تھا۔ یہ چھوٹی چھوٹی رنگ برنگی قوس قزح سے بھرا ہوا ہے۔ ڈائنا کی ماں نے بتایا تھا کہ یہ ان کے ایک پرانے کیمپ کا ٹکڑا ہے لیکن ہم کہتے ہیں اسے پریاں یہاں بھول گئی تھیں۔ ایک رات جب وہ یہاں ناچ گانے کی محفل سجا کے جا رہی تھیں تو اسے بھول گئیں اسی لئے ہم اسے پریوں کا طلسمی شیشہ کہتے ہیں..... میریلا آپ کو پتہ ہے کہ کل ڈائنا چھوٹی آستینوں والا فراک پہن کر آئے گی۔ اف میریلا میں اس پکنک کے سلسلے میں بڑی جذباتی ہو رہی ہوں اگر میں کسی وجہ سے رہ گئی تو مجھے ساری عمر افسوس رہے گا چاہے اس کے بعد میں ہزاروں پکنکوں پر ہی کیوں نہ چلی جاؤں۔ پتہ ہے ہم اس میں کشتیوں کی سیر کریں گے اور آئس کریم بھی کھائیں گے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا ناں کہ میں نے کبھی آئس کریم نہیں کھائی ہے..... پتہ نہیں کیسی ہوتی ہے..... ڈائنا نے مجھے بتانے کی کوشش کی تھی لیکن میرا خیال ہے جب تک میں اسے خود نہ چکھ لوں اس کا ذائقہ اور اصلیت نہیں جان سکتی۔ سنا ہے کہ یہ ہوتی ہی اتنی حیران کن چیز ہے۔"

"این میں نے گھڑی میں دیکھا ہے کہ تم مسلسل دس منٹ سے بولے چلی جا رہی ہو۔ کیا اب محض ایک ٹیسٹ کے طور پر تم اتنی ہی دیر چپ بھی رہ سکتی ہو!"

میریلا کا اعتراض سن کر این فوراً خاموش ہو گئی لیکن بعد میں اس نے سارا ہفتہ مسلسل پکنک کی ہی باتیں کیں اور پکنک کے ہی خواب دیکھے۔

اس روز وہ چرچ جانے لگے تو میریلا نے اپنا وہی قیمتی نیلم والا بروچ سینے پر سجا لیا تھا جسے ہمیشہ ہی وہ بڑے اہتمام کے ساتھ پہنتی تھی، بالکل ایسے ہی جیسے وہ بائبل کو ساتھ لے جانا نہ بھولتی تھی۔ یہ اکلوتا زیور اس کا سب سے قیمتی اثاثہ تھا۔ میریلا کے ایک دور دراز کے انکل نے اسے اس کی ماں کو دیا تھا جس نے بعد میں اسے میریلا کے حوالے کر دیا۔ یہ بیضوی شکل کا بروچ تھا جس کے کناروں پر بہت ہی اعلیٰ قسم کے نیلم لگے تھے۔ میریلا نیلموں کے بارے میں کچھ زیادہ تو نہ جانتی تھی لیکن اسے پہن کر اس کے اندر ایک عجب طرح کا وقار آجاتا اور اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس میں سے نکلتی ہوئی نیلگوں روشنی اسکے گلے کے اندر اترتی جا رہی ہو۔

این جب بھی اس بروچ کو دیکھتی اس پر فدا ہو جاتی۔ "میریلا! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ اسے پہن کر اپنی توجہ عبادت کی طرف کیسے کر لیتی ہیں..... میں نے پہلے پہل جب ہیروں کو نہیں دیکھا تھا تو سوچتی تھی کہ جانے وہ کیسے ہوتے ہوں گے لیکن جب پہلی بار میں نے ایک بڑے سارے ہیرے کو

دیکھا تو اتنی مایوس ہوئی کہ رونے لگی۔ وہ خوبصورت تو تھا لیکن میرے تصور کے بالکل برعکس تھا..... میریلا آپ مجھے ایک منٹ کے لئے بروچ کو ہاتھ میں لینے دیں گی؟"

سوموار کی شام کو میریلا اپنے کمرے میں سے پریشانی کے عالم میں نیچے اتری..... "این! کیا تم نے میرا نیلم والا بروچ دیکھا ہے؟ میرا خیال ہے کہ میں نے کل اسے چرچ سے آنے کے بعد اپنے پن کشن میں اٹکایا تھا، لیکن اب وہ وہاں نہیں ہے۔"

"میں نے اسے کل سہ پہر میں دیکھا تھا جب آپ باہر گئی ہوئی تھیں۔" این آہستگی سے بولی۔ "میں آپ کے کمرے کے سامنے سے گزری تو وہ دروازے سے نظر آیا تھا۔ اسے دیکھ کر میں اندر آگئی تھی اور پھر میں نے اسے تھوڑی دیر کے لئے اپنے سینے پر رکھ کر دیکھا تھا کہ کیسا لگتا ہے۔"

"تم نے بڑی غلطی کی۔ تمہاری عمر کی لڑکیاں یوں بڑوں کی چیزوں کو چھیڑتی پھریں یہ کوئی اچھی بات تو نہیں..... تم نے اسے دوبارہ کہاں رکھا تھا؟"

"وہیں ڈریسنگ ٹیبل پر..... میریلا میں نے اسے صرف ایک منٹ کے لئے لیا تھا اور پھر وہیں رکھ دیا تھا۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ ایسا ہرگز نہ کروں گی۔"

"تم نے دوبارہ اسے وہاں نہیں رکھا۔ وہ وہاں ہے ہی نہیں۔"

"میں نے اسے وہیں رکھا تھا..... یہ تو یاد نہیں کہ دوبارہ پن کشن میں اٹکایا تھا یا نہیں لیکن اسے رکھا وہیں تھا۔"

"اچھا میں دوبارہ جا کے دیکھتی ہوں..... اور اگر وہ وہاں نہ ملا تو سیدھی سی بات ہے کہ تم نے اسے وہاں رکھا ہی نہیں..... اور بس!!"

میریلا دوبارہ اوپر گئی اور ہر جگہ تلاش کیا، نہ صرف ڈریسنگ ٹیبل پر بلکہ اوپر نیچے ہر جگہ۔ پھر وہ مایوس ہو کر واپس لوٹ آئی۔

"این! بروچ بالکل غائب ہے..... اور یہ تو تم خود مانتی ہو کہ اسے آخری بار بس تم نے دیکھا تھا۔ اب خدا جانے تم نے اس کا کیا کیا۔ کہیں گم کر دیا یا پھینک دیا۔ اب الٹی سیدھی باتیں کر رہی ہو۔ جاؤ اپنے کمرے میں اور جا کر سوچو اطمینان سے فیصلہ کرو اور پھر آ کر حقیقت مجھے بتاؤ۔"

"کیا میں مٹر بھی اپنے ساتھ لے جاؤں؟"

"نہیں ان کے چھلکے میں خود ہی اتار لوں گی۔ تم بس اندر جاؤ اور خود کو اعتراف جرم کے لئے تیار کرو۔"

این کے جانے کے بعد میریلا پھر سے کام میں لگ گئی لیکن اس کے خیالات بروچ میں ہی اٹکے رہے۔

شام تک وہ کتنی ہی بار اپنے کمرے میں گئی کہ شاید بروچ کہیں مل جائے لیکن ہر بار اسے مایوسی ہوئی۔

اس روز وہ کسی کام سے باہر نہ جا سکی اور این نے بھی مان کر نہ دیا۔ بلکہ اب تو وہ رونے بھی لگی تھی..... "میریلا! کل تو پکنک ہے۔ آپ مجھے اس پر جانے سے تو نہیں روکیں گی ناں؟؟" این نے سسکیوں کے بیچ میں میریلا سے پوچھا "بس کل سہ پہر کے لئے مجھے جانے دیں اس کے بعد جتنی دیر کے لئے آپ چاہیں مجھے بند کر دیجئے گا۔"

"دیکھو تم نہ تو پکنک پر جاؤ گی اور نہ ہی کہیں اور..... اس وقت تک نہیں جب تک تم اعترافِ جرم نہیں کر لیتیں۔" میریلا نے بڑی سختی سے کہا اور بھناتی ہوئی دروازہ بند کر کے چلی گئی۔

بدھ کی صبح جب میریلا ناشتہ لے کر آئی تو این بستر کے کنارے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں، رنگت پیلی پڑ گئی تھی اور ہونٹ سوکھ رہے تھے۔

"میریلا!..... میں اعتراف کرتی ہوں، بروچ میں نے ہی لیا تھا۔"

این کے منہ سے الفاظ سنتے ہی میریلا نے ٹرے ایک طرف رکھ دی اور "آہا" کہہ کر این کے اعترافِ جرم کی تفصیل سننے کو اس کے پاس بیٹھ گئی۔

"جیسا کہ آپ کا خیال تھا میریلا میں ہی بروچ کو اٹھا کر لے گئی تھی..... دراصل جب میں کمرے میں آئی تو میرا اسے لے جانے کا ارادہ بالکل نہیں تھا لیکن جب میں نے اسے اپنے سینے پر سجایا تو مجھے وہ اتنا خوبصورت اور پیارا لگا کہ میرا دل اسے اتارنے کو نہیں چاہا میں نے سوچا کہ اگر اسے "آئیڈل وائلڈ" لے جاؤں تو کتنا مزہ آئے گا۔ پھر میں کھیل ہی کھیل میں لیڈی کارڈیلیا بن جاؤں گی"..... این یوں تیزی سے بول رہی تھی جیسے کوئی رٹا رٹایا سبق دُہرا رہی ہو۔ "میں نے سوچا تھا کہ آپ کے آنے سے پہلے پہلے اسے واپس رکھ دوں گی..... لیکن جب میں پل کے اوپر سے گزر رہی تھی تو میرا دل چاہا کہ اسے ایک نظر پھر دیکھوں۔ دن کی روشنی میں واقعی وہ کتنا چمک رہا تھا..... میں ابھی ریلنگ کے ساتھ ٹیک لگا کر اس کی خوبصورتی کا نظارہ ہی کر رہی تھی کہ اچانک جانے کس طرح وہ میرے ہاتھوں سے پھسل کر جھیل میں گر گیا اور گہرے پانیوں کے نیچے کہیں کھو گیا..... بس میریلا یہی وہ سارا واقعہ ہے جس کا میں اعتراف کرتی ہوں۔"

میریلا کو یوں لگا جیسے غصے کی ایک شدید لہر اس کے اندر سے اُبلنے کو ہے۔ اس بے وقوف لڑکی نے

اس کی زندگی بھر کی سب سے قیمتی چیز اتنی لاپرواہی سے گم کر دی تھی اور اب سامنے بیٹھی خاموشی سے یوں دیکھ رہی تھی جیسے یہ تو کوئی بات ہی نہ ہو۔

"کتنے افسوس کی بات ہے۔" میریلا غصے پر قابو پاتے ہوئے بولی "آج تک میں نے جتنی بھی غلط اور خراب لڑکیاں دیکھی ہیں تم ان میں سب سے بری ہو۔"

"ہاں وہ تو میں ہوں ..... لیکن میں چاہتی ہوں کہ مجھے میرے جرم کی سزا فوراً مل جائے اور میں اطمینان کے ساتھ پکنک پر جاسکوں۔"

"پکنک!!! این صاحبہ آج آپ کسی پکنک پر نہیں جاسکتیں اور یہی تمہاری سزا ہے۔"

این سکتے میں آگئی۔ اس نے مایوسی کے عالم میں میریلا کا ہاتھ زور سے دبوچ لیا "آپ نے تو مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں غلطی کا اعتراف کرلوں تو..... پلیز میریلا مجھے آپ اور جو چاہیں سزا دے لیں لیکن پکنک پر جانے سے نہ روکیں۔ ہو سکتا ہے آئندہ مجھے یوں آئس کریم کھانے کا موقع زندگی بھر نہ مل سکے۔"

میریلا نے سختی سے اسکا ہاتھ جھٹک دیا "تم زیادہ منت سماجت مت کرو۔ بس تم نہیں جاسکتیں، اب اس سے زیادہ ایک لفظ مت کہنا۔"

اس طرح کا قطعی انکار سن کر این بستر پر ڈھیر ہوگئی اور اوندھی لیٹ کر رونے لگی۔

میریلا نے اس بڑی برق رفتاری کے ساتھ تمام کام نپٹایا۔ پورچ کو خوب مل مل کر دھویا اور باورچی خانے کی شیلفیں خوب صاف کیں حالانکہ یہ سب کچھ پہلے سے ہی صاف تھا اور مزید صفائی کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

جب میریلا نے برتن بھی دھولئے اور کچن سے پوری طرح فارغ ہوئی تو اسے خیال آیا کہ اس کی سب سے پسندیدہ کالے رنگ کی شال میں ایک جگہ تھوڑے سے رفو کی ضرورت ہے اسے سوموار کو اس میں اس وقت ایک چھوٹا سا سوراخ دکھائی دیا تھا جب وہ باہر سے لوٹی تھی۔

شال میریلا کے ایک صندوق میں ایک ڈبے کے اندر بند تھی۔ جیسے ہی اس نے اسے باہر نکالا، کھڑکی سے آنے والی دھوپ اس پر پڑی اور اس میں ایک جگہ جیسے روشنی کی ہزاروں لاکھوں کرنیں پھوٹ پڑی ہوں۔ نیلگوں روشنی کی جگمگاہٹ نے میریلا کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا اور اس نے جھپٹ کر چمکنے والی اس چیز کو دبوچ لیا۔ یہ اس کا وہی قیمتی بروچ تھا جو شال میں لگی لیس کے دھاگوں میں اٹکا ہوا تھا۔

"اوہ میرے خدا" میریلا کے منہ سے بے اختیار نکلا "یہ کیسے ہوگیا!! میرا پیارا بروچ یہاں صحیح سلامت موجود ہے اور میں سمجھ رہی تھی یہ اس وقت جھیل کی تہہ میں کہیں پڑا ہوگا..... اوہ اب مجھے یاد

آرہا ہے کہ جب میں نے سوموار کی سہ پہر کو شال اتاری تھی تو اسے کچھ دیر کے لئے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ شاید بروچ اسی وقت اس میں اٹک گیا ہوگا..... لیکن پھر این نے یہ کیوں کہا تھا کہ وہ اسے لے گئی تھی اور وہ پانی میں گر گیا تھا..... "

میریلا بروچ کو لے کر باہر نکل آئی۔ اس وقت تک این نے رو رو کر جی ہلکان کر لیا تھا اور اب کھڑکی کے پاس بیٹھی تھی۔

"این شرلے" میریلا نے پیار بھرے لہجے میں اسے اس کے پورے نام سے پکارا "مجھے ابھی ابھی وہ بروچ اپنی شال میں اٹکا ہوا مل گیا ہے..... اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ آج صبح تم نے یہ کیا اول فول کہانی سنائی تھی۔ "

"آپ ہی نے تو کہا تھا کہ آپ مجھے اس وقت تک یہاں بند رکھیں گی جب تک میں اعتراف جرم نہ کرلوں۔ " این نے جواب دیا "بس اسی لئے میں نے اعتراف کر لیا کیونکہ میں بہرحال پکنک پر جانا چاہتی تھی۔ اسی لئے رات کو سونے سے پہلے میں نے سارا واقعہ گھڑا، اسے دلچسپ بنایا اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیا تاکہ صبح تک بھول نہ جاؤں..... لیکن آپ نے تو پھر بھی مجھے پکنک پر جانے نہیں دیا۔ میری ساری محنت اکارت گئی۔ "

میریلا مسکرانے لگی "این دراصل میں غلطی پر تھی مجھے تم پر شبہ کرنا ہی نہیں چاہئے تھا کیونکہ تم نے تو کبھی بھی جھوٹ نہیں بولا..... اچھا اب اٹھو اور جلدی سے پکنک پر چلنے کی تیاری کرو۔ "

این کسی راکٹ کی مانند اٹھ کھڑی ہوئی..... "اوہ میریلا! کیا اب دیر نہیں ہو چکی ہے؟"

"نہیں ابھی تو صرف دو بجے ہیں اور وہ لوگ ابھی تک اکٹھے ہو رہے ہوں گے۔..... تم بس جلدی سے ہاتھ منہ دھو کر تیار ہو جاؤ۔ گھر میں کھانے کو بہت کچھ تیار رکھا ہے اور میں تمہارے لئے تھوڑا سا جوس بھی بنا دیتی ہوں اور تمہیں وہاں چھوڑ آتی ہوں۔"

"اوہ میریلا" این خوشی کے مارے چیخی "صرف پانچ منٹ پہلے میں اتنی اداس تھی کہ سوچ رہی تھی آخر پیدا ہی کیوں ہوئی تھی لیکن اب..... اب..... "

اس رات این گھر لوٹی تو بری طرح تھک چکی تھی لیکن وہ مکمل طور پر خوش اور مطمئن تھی.....

"میریلا۔ آج میں نے اپنی زندگی کا بہترین وقت گزارا ہے۔ آج کی ہر چیز اور ہر لمحہ حسین تھا۔ ہم نے اعلیٰ قسم کی چائے پی اور پھر مسٹر ہارمن اینڈریوز ہمیں چمکتے پانیوں کی جھیل کی سیر کو لے گئے..... اور جین اینڈریوز تو ایک بار پانی میں گرنے ہی لگی تھی مسٹر اینڈریوز اسے نہ پکڑتے تو وہ بس ڈوب ہی جاتی..... میں سوچتی ہوں کاش اس کی جگہ میں ہوتی..... اف۔ ڈوبتے ڈوبتے بچ جانا بھی کتنا خوبصورت تجربہ ہوتا اور اسے

سنانے میں کتنا مزہ آتا ...... اور پھر ہم نے آئس کریم بھی تو کھائی ...... میریلا ...... آئس کریم کیسی ہوتی ہے۔ یہ میں بتا نہیں سکتی بس ایک بہت ہی زبردست چیز ہوتی ہے۔ اسے کھایا جا سکتا ہے بتایا نہیں جا سکتا۔

اس رات میریلا نے شال اور بروچ والا سارا واقعہ میتھیو کو سنایا۔ اپنی غلطی پر نادم ہوئی اور بولی ...... "این جس گھر میں بھی رہے گی اس گھر میں اُداسی کبھی قدم نہیں رکھ سکتی۔"

کوڑے دان کی دردمندانہ اپیل

سب کو اپنا حق عزیز ہوتا ہے۔
کوڑا کرکٹ میرا حق ہے
میرے حق کو گلی میں مت پھینکیے۔
مجھے میرا حق دیجیے۔
ورنہ!
مکھیوں، مچھروں اور صفائی پسند
پڑوسیوں سے روزانہ جنگ کے لیے تیار ہو جائیے

پانچ باتیں

عبدالقادر

رات کی پر سکون ساعت میں
محو تھا اک ولی عبادت میں

اک صدا غیب کی سنائی دی
پانچ کاموں کی یوں ہدایت کی

گھر سے جب تم سویرے جاؤ گے
پانچ چیزیں ضرور پاؤ گے

جب ملے پہلی، اس کو پی لینا
دوسری چیز کو چھپا دینا

تیسری چیز کی حفاظت ہو
اور چوتھی کی پوری حاجت ہو

پانچویں چیز کو جوں ہی پاؤ
اس سے فی الفور دور ہو جاؤ

گھر سے باہر سویرے جب آیا
اک سمندر کو سامنے پایا

ہاتھ اس میں جو اپنا پہنچایا
ایک چلو میں وہ سمٹ آیا

وہ سمندر جو سخت نمکیں تھا
اب وہ لذت میں خوب شیریں تھا

آگے سونے کی اک ملی تھالی
دفن اس نے زمیں میں کر ڈالی

بات حیرت کی یہ نظر آئی
ایک لمحے میں وہ ابھر آئی

اک پرندہ کہیں سے اڑتا ہوا
آگیا خوف سے لرزتا ہوا

اس کو درویش نے پناہ دے دی
ننھے طائر کی یوں حفاظت کی

ایک شاہیں اس کے پیچھے ہی
آگیا اور یہ گزارش کی

بھوک سے خستہ حال ہے میرا
آپ سے اک سوال ہے میرا

یہ پرندہ مجھے عنایت ہو
ہے تمنا کہ پوری حاجت ہو

اب پریشان ہوگیا درویش
مسئلہ تھا عجیب سا پیش

کاٹ کر بوٹی ران سے اپنی
کر دی حاجت روائی شاہیں کی

آگے انساں کی لاش جب دیکھی
بھاگ کر اس نے راہ لی گھر کی

رات کو پھر حضور باری میں
تھا وہ مصروف آہ و زاری میں

عرض کرنے لگا، خداوندا
راز بتلا دے پانچ کاموں کا

آئی آواز اے مرے بندے
تیرے مقبول ہوگئے سجدے

جس سمندر کو تو نے دیکھا ہے
وہ سمندر نہیں ہے، غصہ ہے

اپنا غصہ ہمیشہ پی جاؤ !!!!!
آبِ کوثر کا پھر مزا پاؤ

اور تھالی جو تونے دیکھی ہے
وہ حقیقت میں ایک نیکی ہے

کوئی اس کو چھپا نہیں سکتا
اس کو ہرگز مٹا نہیں سکتا

جو پرندہ ملا، امانت ہے
اور شاہیں نشانِ حاجت ہے

مت ہو غافل کبھی امانت سے
باز رہنا سدا خیانت سے

جو بھی حاجت روائی کرتا ہے
اپنا دامن خوشی سے بھرتا ہے

لاش غیبت کی اک علامت ہے
اور غیبت بڑی خباثت ہے

پانچ باتوں کی یہ حکایت ہے
یاد رکھنا یہی عبادت ہے

طاقت، توانائی اور صحت
احمد مربہ جات کی بدولت
احمد کے مربہ جات تازہ اور معیاری پھلوں سے طبی
اصولوں کے عین مطابق تیار کیے جاتے ہیں۔ ان کا باقاعدہ
استعمال طاقت اور توانائی پیدا کرکے آپ کو
چست اور صحت مند رکھتا ہے۔
AHMED
AMLA PRESERVE
(AMLA IN SYRUP)
(GOOSEBERRY)
APPLE PRESERVE
(APPLE IN SYRUP)
AHMED
HURDA PRESERVE
(HURDA IN SYRUP)
(Phyllanthus emblica)
مربہ گاجر

فرزانہ روحی

شکریہ دادا جان

ہر وقت بولنے والی ببلی بالکل چپ تھی۔ اس نے رات کو کھانا بھی نہیں کھایا اور یونہی سو گئی۔

"مجھے کچھ نہیں کھانا۔" صبح جب ناشتے پر اسے بلایا گیا تو اس نے غصے بھری آواز میں آہستگی سے جواب دیا۔

"ناشتہ کر لو ببلی! دیکھو دودھ ٹھنڈا ہو رہا ہے اور آملیٹ تمہارے انتظار میں سوکھ رہا ہے۔" ناصر بھیا نے نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے زور سے کہا۔

"اونہہ، میرا انتظار۔" اس نے یونیفارم پہنتے ہوئے خود سے کہا۔

"ببلی! جلدی آجاؤ، ورنہ ..... تمہارے ٹوسٹ میرے پیٹ میں چلے جائیں گے۔" چھوٹے بھیا اپنا ناشتہ کر چکنے کے باوجود اس کے ٹوسٹ پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔

ببلی نے جھٹکے سے دروازہ کھولا اور بیگ اٹھا کر باہر نکل گئی۔ حالاں کہ اسکول بس ابھی نہیں آئی تھی مگر آج خلافِ توقع وہ پہلے ہی بس کے انتظار میں باہر نکل گئی۔

شاید یہ اس کی اپنی غلطی تھی کہ اس نے کل دادا جان کی برسی پر ضد کر کے چمکتا دمکتا گوٹے کناری

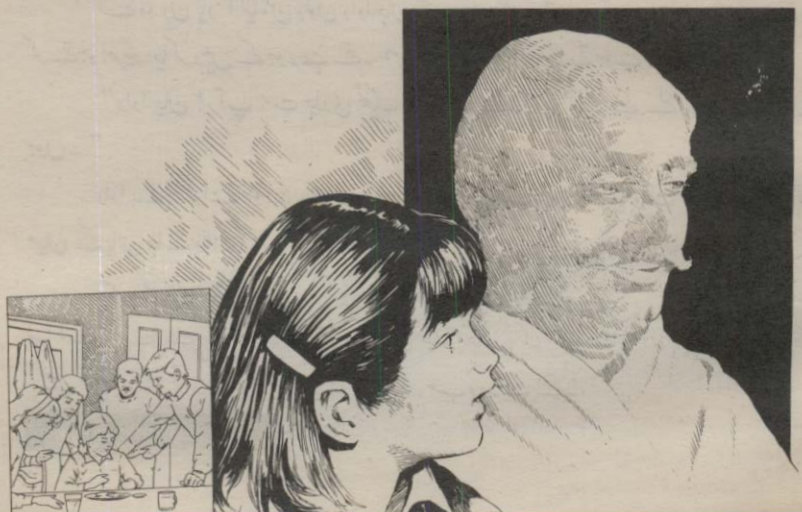

والا سوٹ پہن لیا تھا۔ سب نے بہت سمجھایا، "ببلی! یہ کوئی خوشی کا موقع نہیں بلکہ غم کی بات ہے، کوئی سادہ سی فراک پہن لو۔" مگر نہیں۔ اس نے تو وہی سوٹ پہنا کیوں کہ اس کا خیال تھا اس طرح دادا جان کی روح خوش ہو جائے گی۔ آخر وہ سوٹ سلوایا بھی تو دادا جان نے ہی تھا۔ چمکتا جگمگاتا سوٹ جب اس نے پہنا تو سب نے اسے ناراضگی سے دیکھا۔ "ببلی بہت گندی بچی ہے، نافرمان ہو گئی ہے، بڑوں کی بات نہیں مانتی۔" چچا جان بھی ناراض تھے۔

اسے اچھی طرح یاد تھا۔ دادا جان کے منع کرنے کے باوجود چھوٹے چچا جب امریکہ چلے گئے تو دادا کس قدر ناراض تھے..... اور اداس بھی۔ تب ببلی نے انہیں کہا تھا۔ "دادا ابا! میں آپ کو کبھی چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔" اس کی معصومانہ بات پر دادا جان نے اسے خوب پیار کیا تھا، "ببلی تو بہت فرمانبردار بچی ہے۔" یہ سن کر تو اس کا سیروں خون بڑھ گیا تھا۔

اور اب وہی چچا اسے نافرمان کہہ رہے تھے۔ اس بات پر تو اس کا ننھا سا دل ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا۔ "کاش آج دادا جان زندہ ہوتے، تو..... وہ مجھے ہرگز، ہرگز اداس نہ ہونے دیتے۔" دادا جان کو یاد کرتے ہوئے اس کی آنکھیں بھر آئیں اور ننھے ننھے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ جنہیں اس نے جلدی سے پونچھ ڈالا اور آسمان کی طرف دیکھتی ہوئی دادا سے مخاطب ہوئی۔

"دادا ابا! دیکھئے میں آپ کے لئے رو رہی ہوں۔ آپ مجھ سے ملنے کیوں نہیں آتے؟!" اس نے شکایت کی۔ وہ روزانہ دادا جان کے کمرے کی صفائی کرتی اور وہاں پھول سجاتی، کیوں کہ اسے یقین تھا کہ ایک دن دادا جان اس سے ملنے ضرور آئیں گے۔ مگر کب اور کس طرح؟ یہ تو اسے پتہ ہی نہیں تھا۔

اسے وہ دن یاد آگیا جن دنوں دادا جان سخت بیمار تھے۔ تب وہ چھوٹے چچا کو شدت سے یاد کرتے جو امریکہ جا کر وہیں کے ہو رہے تھے۔ اس نے دادا ابا کا سر دباتے ہوئے کہا تھا،

"دادا جان! آپ بہت جلدی ٹھیک ہو جائیں گے، میں آپ کے لئے بہت دعائیں کرتی ہوں۔"

دادا نے مسکراتے ہوئے دھیرے سے کہا تھا۔ "اب میرا آخری وقت آگیا ہے میں اللہ میاں کے پاس جانے والا ہوں۔" پھر انہوں نے کانپتے ہاتھوں کو ببلی کی جانب بڑھایا اور بولے، "مگر ..... میں تم سے ملنے ..... آیا کروں گا۔" اس کے بعد ..... اس کے بعد ابو نے فوراً اسے کمرے سے باہر جانے کا حکم دے دیا تھا۔ حالاں کہ اس نے تو دادا جان سے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ پھر..... کچھ ہی دیر بعد..... سب رو رہے تھے۔

دادا جان، اللہ میاں کے پاس جا چکے تھے۔

اپنی سمجھ کے مطابق بلی ہر وہ کام کرتی جس سے دادا ابا اللہ میاں کے پاس رہ کر بھی اس سے خوش رہتے۔ اسکول میں تو وہ مصروف رہتی مگر گھر آ کر اسے دادا کی یاد شدت سے آتی۔ خاص طور پر جب بھی کوئی روک ٹوک ہوتی یا ڈانٹ پڑتی تو اس کا دل چاہتا کہ فوراً دادا کی گود میں جا کر چھپ جائے۔

اسکول سے واپس آ کر وہ یونہی کچھ کھائے پیئے بنا سو گئی۔ مگر بھلا بھوکے پیٹ اسے نیند کس طرح آتی۔ پھر بھی یونہی آنکھیں میچے جھوٹ موٹ وہ سوتی بن گئی۔ شاید امی کھانے کے لئے اٹھانے آجائیں۔ یہ سوچ کر اس کے کان دروازے کی سمت قدموں کی آہٹ کے منتظر رہے مگر ..... کوئی بھی تو نہیں آیا۔

"بلی، کہاں ہے؟" ابو پوچھ رہے تھے۔

"وہ بے وقوف ابھی تک ناراض ہے۔" یہ ناصر بھیا کی آواز تھی۔

"کیا! بے وقوف" اسے بہت غصہ آیا اور رونا بھی۔ وہ دوڑ کر دادا جان کے کمرے میں گھس گئی۔ ارے، یہ کیا ..... ناصر بھیا کی میلی شرٹ، دادا جان کے صاف ستھرے کمرے میں پڑی تھی، انہوں نے وہاں کپڑے تبدیل کئے تھے۔

"اف اللہ! بھیا نے دادا ابا کے کمرے کو اسٹور بنا لیا ہے۔" اس نے دکھ سے سوچا اور شرٹ کو لپیٹ کر صحن میں زور سے پھینک دیا۔ اور چلائی۔ "یہ فالتو کپڑا کس نے دادا ابا کے کمرے میں رکھا ہے؟"

"بلی بیٹے!، یہاں آؤ۔" ابو کے پکارنے پر وہ ان کے قریب گئی۔

"لو بیٹھ جاؤ۔" ناصر بھیا جو اس کی کرسی پر براجمان تھے، اٹھتے ہوئے بولے۔ اس نے تو دیکھا ہی نہیں تھا کہ بھیا اس کی کرسی پر قابض ہیں ورنہ وہ تو انہیں نوچ کر اٹھا دیتی۔ وہ منہ پھلائے کھڑی رہی۔

"بلی سب سے ناراض ہے۔" چھوٹے بھیا پانی پیتے ہوئے بولے۔

"جی نہیں، میری بلی کسی سے ناراض نہیں ہے۔ اسے تو دادا ابا کی یاد نے اداس کر دیا ہے۔ ہے ناں بلی۔ چلو اب جلدی سے کھانا کھالو۔" ابو اسے پیار سے منا رہے تھے۔

اس نے ایک نظر ٹیبل پر ڈالی، آلو کی بھجیا، سلاد، چاول اور تلی ہوئی مچھلی دیکھ کر اس کا دل چاہا کہ سب کچھ فوراً ہڑپ کر لے مگر ..... اسے بھی ضد تھی کہ وہ ہرگز نہیں کھائے گی۔

"ارے آپ کھانا کھائیے، اسے چھوڑیئے۔ اسکول میں تو اس نے کھایا ہی ہوگا۔" امی کچن سے بول رہی تھیں۔ مگر لنچ بکس تو بلی گھر میں ہی چھوڑ گئی تھی۔ اور شاید وہ چھوٹے بھیا کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ جبھی امی جان کو علم نہ ہو سکا اور وہ سمجھ رہی تھیں کہ اس نے لنچ اسکول میں کر لیا۔

"اف، اف، اس گھر میں تو کسی کو میرا خیال نہیں ہے۔" وہ دوڑتی ہوئی ڈرائنگ روم میں چلی گئی اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

"چنے گارام، چنے گارام۔" اس نے چنے والے کی آواز سن کر پاکٹ میں سے پیسے نکالے۔ پورا ایک روپیہ تھا۔ کھڑکی سے ہی اس نے ایک روپے کے چنے خرید لئے۔ اور وہیں کمرے میں بیٹھے بیٹھے ہی کھا گئی۔ جانے کب اسے نیند آگئی۔ جب آنکھ کھلی تو صوفے پر پڑی تھی۔ اس نے اٹھنا چاہا پر نہ اٹھ سکی۔ پیٹ میں شدید درد تھا۔ اس نے کراہتے ہوئے دروازے کی جانب دیکھا، مگر دروازہ تو اس نے اندر سے لاک کر رکھا تھا۔

"آہ، اب کیا ہوگا؟!" اس نے کراہتے ہوئے سوچا۔ اب میں مرجاؤں گی اور کسی کو خبر بھی نہ ہوگی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے پیٹ کو دباتے ہوئے پکارا۔

"امی! ابو" ..... مگر اس کی آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی اور آنکھیں بند ہونے لگیں۔ پھر اسے ہلکا سا شور سنائی دیا۔ یوں لگا جیسے اس کے مرنے پر سب رو رہے ہوں۔

لیکن کچھ ہی دیر بعد دادا کی آواز سنائی دی۔

جیسے وہ اس کے سرہانے بیٹھے بول رہے ہوں۔ "بلی بیٹے! آپ نے آج کیا کھایا تھا؟ چپکے سے مجھے بتا دیجئے۔ پھر وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

"چنے ..... چنے کھائے تھے دادا جان۔ اور کچھ بھی نہیں۔" اس نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھولے بغیر جواب دیا۔ "رات کو کھانا کیوں نہیں کھایا تھا اور صبح ناشتے کے بغیر اسکول کیوں گئیں۔ یہ تو بہت بُری بات ہے بیٹے۔"

"میں سب سے ناراض ہوں۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"بہت بُری بات۔ اچھا لو یہ دوا کھالو۔" پھر کوئی پھیکی سی دوا دادا جان نے چمچے سے اس کے منہ میں ڈال دی۔

دادا جان کے ہاتھوں سے دوا کھا کر اسے بہت سکون محسوس ہوا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد اس نے آنکھیں کھول دیں اور چاروں جانب دیکھتی ہوئی بولی۔

"دادا جان ..... دادا جان؟"

امی، ابو، ناصر بھیا، چچا جان اور چھوٹے بھیا اس کے چاروں طرف موجود تھے۔ "مگر دادا ابا!؟" وہ حیرت زدہ تھی۔

"اب طبیعت کیسی ہے بیٹے؟" امی، ابو اور چچا جان نے ایک ساتھ پوچھا۔

ناصر بھیا ہلکے ہلکے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر رہے تھے۔

"کیا .... کیا دادا جان آئے تھے؟ انہوں نے مجھے دوا پلائی تھی اور باتیں بھی کیں؟" دوا کا مزہ اب تک اسے محسوس ہو رہا تھا۔

"اوہ، شاید وہ جا چکے ہیں۔" وہ خود سے گویا ہوئی۔

"چچا جان! کیا آپ نے انہیں دیکھا؟"

"نہیں بیٹے، ان کی روح آئی تھی اور روحیں نظر نہیں آتیں۔ وہ تو صرف تم سے ملنے آئے تھے۔"

چچا نظریں جھکائے بول رہے تھے شاید وہ اپنی غلطی پر اب تک شرمسار تھے۔ "اچھا۔" دادا ابا کی روح صرف مجھ سے ملنے آئی تھی۔" خوشی سے اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"آپ نے ان کی آواز تو سنی ہوگی؟"

"ہاں بیٹے! وہ تم سے باتیں کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے۔ جس طرح تمہارے چچا مجھے ناراض کرتے تھے۔ تنگ کیا کرتے تھے۔ تم اس طرح اپنے بڑوں کو ناراض نہ کیا کرو نہ ہی تنگ کیا کرو۔ ورنہ میں تم سے ہمیشہ کے لئے ناراض ہو جاؤں گا۔"

"اچھا تو کیا انہیں پتہ چل گیا تھا کہ میں سب سے ناراض ہوں؟"

"اور کیا، ان کی روح اکثر تم سے ملنے آتی ہے جب تم سو جاتی ہو تو وہ تمہیں پیار کر کے چلے جاتے ہیں۔"

وہ حیران حیران سی چچا جان کی باتیں سن رہی تھی۔ اب تو اس کے درد کی شدت بھی کم ہو چکی تھی۔

"چلو بھئی، سب باہر جاؤ، ببلی آرام کرے گی۔" چچا جان نے سب کو باہر جانے کے لئے کہہ دیا۔

"کیا واقعی، دادا جان کی روح آئی تھی؟" بے یقینی کے ساتھ اس نے خود سے سوال کیا۔ کمرے کا دروازہ تو اس نے خود اندر سے بند کیا تھا پھر یہ کس طرح کھلا اور سب لوگ کیسے اندر آئے؟ یقیناً دادا ابا کی روح نے دروازہ کھولا ہوگا۔ اور وہ خود کھڑکی کے راستے آئے ہوں گے ورنہ

میں تو اب تک مر گئی ہوتی۔

"اوہ ! شکریہ .... شکریہ دادا جان .... بہت بہت شکریہ۔"

اس نے کھڑکی سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اسی دوران چھوٹے بھیا مسکراتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ وہ فیصلہ کر چکے تھے کہ ببلی کو کبھی نہیں بتائیں گے کہ دروازے کے لاک میں ماچس کی تیلی پھنسی ہوئی تھی جس سے وہ لاک نہیں ہو سکا تھا اور ڈاکٹر صاحب کو بھی وہی بلا کر لائے تھے۔

ادیب نگر

طاہر مسعود

۱۷۸۲ء کی ایک دوپہر کو بمبئی کے ساحل پر ایک بحری جہاز لنگر انداز ہوا۔ جہاز سے جو مسافر اترے ان میں اکثریت ایسے یورپیوں کی تھی جو ہندوستان کی دولت و حشمت کا چرچا سن کر یہاں آئے تھے تاکہ یہاں سے مال و زر لوٹ کر یورپ لے جائیں اور بقیہ زندگی عیش و آرام سے گزاریں۔ ان دنوں ہندوستان ایسٹ انڈیا کمپنی کی سازشوں اور مکر و فریب کے جال میں گرفتار تھا۔ اور سلطنت کا بڑا حصہ دیسی حکمرانوں سے نکل کر کمپنی کے اختیار میں جاچکا تھا یا جانے والا تھا۔ بحری جہاز سے اترنے والوں میں ایک بائیس سالہ نوجوان بھی شامل تھا۔ اس کا نام جان تھوک گل کرسٹ تھا۔ یہ نوجوان بھی ہندوستان قسمت آزمائی کے لئے آیا تھا۔ اس کی متجسس طبیعت ایک نئی سرزمین پہ قدم رکھتے ہوئے کسی قدر مضطرب تھی۔ اس کے ذہن میں مستقبل کا کوئی واضح منصوبہ نہیں تھا۔ ایڈنبرا میں پیدا ہونے اور وہیں کے ایک مقامی تعلیمی ادارے میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اسے روزگار کی تلاش میں وطن سے نکل جانا پڑا تھا۔ کچھ عرصہ اس نے ویسٹ انڈیز میں گزارا جہاں اس نے نیل کی کاشت اور تجارت کرنے میں کچھ وقت لگایا۔ لیکن اس میں

خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا۔ ان ہی دنوں اس نے ہندوستان کا ذکر سنا اور اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ ملک یورپ اور خاص طور پر برطانیہ کے مہم جو نوجوانوں کے لئے قسمت آزمانے کا کھلا میدان ہے۔ جہاں پہنچنے والے کبھی خالی ہاتھ لوٹ کر نہیں آتے۔ خوش قسمتی کے دروازے ان پر کھل جاتے ہیں اور راتوں رات دولت مند بننے کا محاورہ ان پر صادق آتا ہے۔ نوجوان گل کرسٹ نیل کی کاشت سے اب اکتا چکا تھا۔ اور کوئی نادیدہ قوت اسے ہندوستان کی جانب دھکیل رہی تھی۔ لیکن اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ہندوستان میں جا کر قدرت اس سے ایسا کام لے گی کہ اس کا نام تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائے گا۔

بمبئی کے ساحل پر پہنچنے سے پہلے جب گل کرسٹ نے اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنا چاہا تو وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ اس نے ایڈنبرا میں جارج پیرٹس ہاسپٹل سے طب کی تعلیم حاصل کی تھی لیکن اسے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ ہندوستان میں یہ تعلیم اس کے کسی کام بھی آسکے گی یا نہیں۔

بمبئی کے ساحل پر جب وہ اپنے مختصر سے سامان کے ساتھ اترا تو گودی پہ مال اتارنے والے مزدوروں کو اس نے ایک ایسی زبان میں بات چیت کرتے سنا جو اس کے لئے قطعی اجنبی تھی۔ گویا اب وہ ایسے لوگوں کے درمیان پہنچ چکا تھا جن سے وہ اپنی ضرورت بھی بیان نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے سوچا "مجھے کیا کرنا چاہئے۔" یہ سوال ہر اس شخص کے ذہن میں گونجتا ہے جو اچانک اپنے قدموں تلے ایک نئی سرزمین کو پاتا ہے۔ لیکن گل کرسٹ کے ذہن نے نہایت برق رفتاری سے اس سوال کا نپا تلا جواب دے دیا۔

"مجھے سب سے پہلے ان باشندوں کی زبان سیکھنی چاہئے جن کے درمیان مجھے آئندہ اپنی زندگی بسر کرنی۔ ... کیونکہ"..... جیسا کہ اس نے بعد میں لکھا "ہندوستان میں میرا رہنا اس وقت تک خوش گوار نہیں ہو سکتا اور نہ میرے آقاؤں کے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے جب تک اس ملک کی زبان کو میں اچھی طرح نہ سیکھ لوں۔" یہ زبان جسے سیکھنے کا تہیہ گل کرسٹ چشم زدن میں کر چکا تھا۔ اس زمانے میں مورس (Moors) کہلاتی تھی۔ (پھر اسے متفقہ طور پر اردو کا نام دیا گیا) گل کرسٹ کو جلد ہی ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ وہ کمپنی کی فوج میں اسسٹنٹ سرجن مقرر کر دیا گیا۔ ملازمت کے فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ وہ اردو زبان بھی سیکھنے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ لیکن اس کی طبیعت کو قرار حاصل نہیں ہوا تھا۔ وہ اکثر تنہائی میں سوچتا تھا کہ فوج کی ملازمت سے پیٹ کی روٹی تو مل جائے گی لیکن پیٹ تو جانور بھی بھر لیتے ہیں اصل بات تو جب ہے کہ آدمی پیٹ پالنے کے علاوہ اپنی صلاحیتوں کو بھی اجاگر کرے اور کوئی ایسا کام کرے جس سے اس کا نام آئندہ بھی زندہ رہے۔ لیکن وہ کام کیا ہو؟ یہ بات سمجھنے سے وہ قاصر تھا۔ جن دنوں وہ اردو سیکھ رہا تھا اسے خیال آیا کہ وہ اس نئی زبان کے سیکھتے ہی اس پر ایک

کتاب لکھے گا تاکہ اس کی طرح جو لوگ اس زبان کو سیکھنا چاہیں انھیں دشواری کا سامنا نہ ہو۔ اسے خوب اندازہ ہو چکا تھا کہ ایسی زبان کو سیکھنا کتنا مشکل ہے جس پر کتابیں ہی نہ ہوں۔ گل کرسٹ نے جب اردو زبان کی طرف توجہ کی تو اس موضوع پر صرف ایک کتاب اس کے ہاتھ لگی۔

A

GRAMMAR,

OF THE

HINDOOSTANEE LANGUAGE,

OR PART THIRD

OF

VOLUME FIRST,

OF A SYSTEM OF

HINDOOSTANEE PHILOLOGY.

By JOHN GILCHRIST.

اب سامنے میری جو کوئی پیر و جوان ہی	*Ub samne mere jo be,sa-parr o jowan hy*
دعوی نکری یہہ کہ میری موںہہ مین زبان ہی	*Dawa na kare yih ki mere munh men zuban hy*
مین حضرت سودا کو سنا بولتی یارو	*Mein hazrut i Souda ko sunta bolte yare*
اللہ ہی اللہ کہ کیا نظم و بیان ہی	*Ullah hai Ullah ki kya nuzm o byan hy.*

ہر جاکہ سہوی و خطائی واقع ش... ذیل کرم
بپوشند و قلم اصلاح بر ان جاری دارند

"Wherever there shall occur an Omission or Error, cover it with the Mantle of Generosity,
" And hold the Pen of Correction running over it." — DR. BALFOUR's HERKERN.

CALCUTTA:
PRINTED AT THE CHRONICLE PRESS.
M DCC XC VI.

گل کرسٹ کے قواعد کا سرورق۔

یہ جارج ہیڈلے نام کے ایک انگریز کی لکھی ہوئی کتاب تھی۔ وہ اس کتاب کی مدد سے اردو سیکھ ہی رہا تھا کہ اس کی ملاقات ایک منشی سے ہوئی جس نے اسے اردو زبان سکھانے کا وعدہ کیا۔ لیکن جب منشی صاحب کو جارج ہیڈلے کی کتاب کے بارے میں معلوم ہوا تو اس نے گل کرسٹ سے کہا کہ وہ اس کتاب کو بھول جائے۔ بلکہ وہ سب کچھ بھول جائے جو اس نے اِس کتاب سے سیکھا ہے۔ بعد میں گل کرسٹ نے اردو زبان سیکھنے پر جن لوگوں کا شکریہ ادا کیا ان میں سب سے زیادہ شکر گزار وہ مرزا رفیع سودا کا ہوا جن کی کلیات (دیوان) کی مدد سے اس نے اردو میں مہارت حاصل کی۔

گل کرسٹ چونکہ فوج میں ملازم تھا لہٰذا فوج جب ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرح کوچ کرتی تھی تو گل کرسٹ بھی ہمراہ ہوتا تھا۔ اس سفر کے دوران اسے بہت سے گاؤں اور شہروں کو دیکھنے اور مقامی آبادی کی زبان اور رسوم و رواج کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملا۔ یہ دیکھ کر اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی کہ جس زبان کو وہ سیکھنے میں جان توڑ محنت کرتا ہے وہ ہندوستان کے تمام چھوٹے بڑے شہروں میں مقبول ہے۔ عورتیں اور بچے، جوان اور بوڑھے سبھی اس زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ چنانچہ اس کا شوق تیز تر ہو گیا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں صحیح سمت میں محنت کر رہا ہوں۔" اس نے اپنے آپ سے کہا۔

گل کرسٹ نے تین سال کی شدید محنت کے بعد اردو زبان پر عبور حاصل کر لیا اس عرصے میں اس نے اپنی کتاب کے لئے مواد بھی اکٹھا کر لیا۔ اس زمانے میں تصنیف و تالیف کا کام بہت دشوار تھا اور ایک ایسی زبان پہ کتاب لکھنا جو مادری زبان بھی نہ ہو پہاڑ کاٹنے کے برابر تھا۔ زبان سیکھنے اور کتاب لکھنے کے لئے گل کرسٹ نے لکھنؤ، فیض آباد، الہ آباد اور جونپور کا علمی سفر طے کیا۔ اس نے قومی لباس اتار کر ہندوستانی لباس پہن لیا۔ لمبی سیاہ داڑھی بڑھالی۔ اس کی مشکلات کتنی عظیم تھی اس کا اندازہ اس واقعے سے کیا جا سکتا ہے کہ جب اس نے لوگوں سے اردو زبان کے لغت کے بارے میں دریافت کیا تو ان لوگوں نے حیرت سے کہا "کیا بھلا آج تک کہیں بھی کسی نے قواعد و لغت کی مدد سے اپنی زبان سیکھی ہے؟"

سولہ سال تک گل کرسٹ شدید ذہنی کوفت، جسمانی تکلیفیں اور مالی دشواریوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتا رہا اور آخر کار وہ اپنے خواب کو حقیقت کا روپ دینے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کی پہلی کتاب "ہندوستانی لغت" English and Hindustani Dictionary چھپ کر منظر عام پر آ گئی۔ اس کتاب پہ اس نے کتنی محنت کی تھی اور اس کو مکمل کرنے کے لئے اس پر کیسا جنون سوار تھا، اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جن دنوں وہ اس منصوبے پر کام کر رہا تھا، اسے معلوم ہوا کے ایک شخص کپتان کرک پیٹرک کلکتہ میں ہندوستانی قواعد پر کتاب لکھ رہا ہے بلکہ اس کتاب کا بیشتر حصہ چھپ چکا ہے اور باقی حصہ چھپ کر جلد تیار ہو جائے گا۔ یہ اطلاع سن کر گل کرسٹ اتنا پریشان ہوا کہ بیمار پڑ گیا اور اس کی جان کے

لالے پڑ گئے۔ اس بیماری میں اسے خیال آیا کہ اجنبیوں کے درمیان بے نام نشان مر جانا بزدلی ہے اسے
اٹھ کر حالات کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ گل کرسٹ کلکتے جا کر کرک پیٹرک سے ملا اور اسے اطمینان ہوا کہ
پیٹرک کی کتاب ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔ گل کرسٹ نے کتاب تو لکھ لی لیکن مسئلہ اس کی طباعت کا تھا
کیونکہ اس پر کثیر لاگت آرہی تھی۔ اس نے گورنر جنرل کی کونسل کو خط لکھ کر اجازت مانگی کہ اسے اس
مقصد کے لئے نیل کی کاشت کرنے کی اجازت دی جائے۔ اجازت ملنے کے بعد گل کرسٹ نے نیل کی
کاشت شروع کی۔ ساتھ ہی وہ شکر کی تجارت بھی کرنے لگا۔ یوں اس کے مالی حالات اس قابل ہوئے کہ

DICTIONARY,
NGLISH AND HINDOOSTANEE.
TO WHICH IS PREFIXED
A GRAMMAR
OF THE
HINDOOSTANEE LANGUAGE.
BY
JOHN GILCHRIST.

هرجا کہ سهوي و خطائي واقع شود بذيل کرم
بپوشند و قلم اصلاح برآن جاري دارند

Wherever there ſhall occur an Omiſſion or Error, cover it with the Mantle of Generoſity, and hold the Pen of Correction running over it.

DR. BALFOUR'S HERKEREN.

CALCUTTA.
PRINTED BY
STUART and COOPER.
M.DCC.LXXXVI.

گل کرسٹ کے لغت کے پہلے حصے کا سرورق

کتاب شائع ہو سکے "ہندوستانی لغت" کی اشاعت کے بعد گل کرسٹ کی پے در پے تین کتابیں شائع ہوئیں۔

1. A Grammer of the Hindustani Language (1796) (ہندوستانی زبان کے قواعد)

2. The appendix (1798) (ضمیمہ)

3. The Oriental Linguist (1798) (مشرقی زبان داں)

ان کتابوں نے گل کرسٹ کے نام اور کام کی دھوم مچادی۔ اب وہ ہندوستان سے برطانیہ تک اردو زبان کا ماہر تسلیم کیا جانے لگا۔ اور اسے انگریز حکومت کے علاوہ پڑھے لکھے طبقے میں بھی عزت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ لیکن ابھی گل کرسٹ کا کام ختم نہیں ہوا تھا۔ ابھی تو اسے وہ کارنامہ انجام دینا تھا جس کی بنا پر اردو زبان و ادب میں اس کا نام ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی ایک خاص پالیسی کے تحت فارسی زبان کو ختم کرنا چاہتی تھی کیونکہ یہ مسلم حکمرانوں کی زبان تھی۔ اس مقصد کے لئے ضروری تھا کہ فارسی کے مقابلے پر کسی دوسری دیسی زبان کو ترقی دی جائے۔ اردو اس تقاضے پر پوری اترتی تھی۔

لیکن سب سے پہلے تو یہ ضروری تھا کے خود کمپنی کے انگریز ملازمین اردو زبان سیکھیں۔ چنانچہ گورنر جنرل لارڈ ولزلی نے کمپنی کے ان نئے ملازمین کو جو انگلستان سے تازہ تازہ آئے تھے۔ اردو سکھانے کا ارادہ کیا تو اس کام کے لئے ان کی نگاہ انتخاب جان گل کرسٹ پر پڑی۔ لارڈ ولزلی کی ہدایت پر گل کرسٹ نے ۱۷۹۹ء میں ایک مدرسہ قائم کیا اس کا نام "گل کرسٹ کا مدرسہ یا (Orintal Seminary) تھا۔ اس مدرسے کی ساری ذمہ داری گل کرسٹ ہی کے سر تھی۔ اس مدرسے میں انگریز طالب علموں کی تعداد چالیس سے آگے نہ بڑھ سکی۔ یہ ڈیڑھ سال تک چلتا رہا۔ گل کرسٹ نے پڑھانے کے ساتھ ساتھ ایک مختصر سی کتاب فارسی و انگریزی میں بھی لکھی۔ لارڈ ولزلی نے ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا تو گل کرسٹ اس کالج سے وابستہ ہو گیا۔ اس کالج سے وابستگی نے اس پر کامیابی کے نئے دروازے کھول دیئے۔ فورٹ ولیم کالج قائم کرنے کا مقصد یہ تھا کہ جو انگریز کمپنی میں ملازم ہو کر آتے ہیں وہ انگلستان سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے نہیں آتے جبکہ حکومت کرنے کے لئے مختلف علوم و فنون میں مہارت ضروری ہے۔ لہٰذا لارڈ ولزلی کی خواہش تھی کہ فورٹ ولیم کالج علوم و فنون کی اعلیٰ درسگاہ ہو جس میں علمی زبانیں عربی و فارسی، سنسکرت بھی پڑھائی جائیں اور ملکی زبانیں، اردو، بنگالی مرہٹی وغیرہ بھی لیکن کمپنی نے اس کالج پر اٹھنے والے اخراجات کو برداشت کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ اسے صرف زبان دانی کا کالج بنانا پڑا۔ گل کرسٹ نے کالج میں باقاعدہ اردو کی تعلیم شروع کر دی اور تعلیم کے ساتھ ہی اردو کی تالیف و تصنیف کا

محکمہ بھی قائم کر دیا۔ اور ہندوستانی اہل زبان سے اردو زبان میں تصنیف اور ترجمے کا کام بھی لینا شروع کر دیا۔

گلکرسٹ نے اردو کتابیں چھاپنے کے لئے اردو ٹائپ کا مطبع بھی قائم کیا۔ یہ ہندوستان اردو کا سب سے پہلا چھاپہ خانہ تھا۔ گل کرائسٹ کا اردو زبان پر سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس وقت تک سارے ہندوستان میں اردو نثر کی ایک کتاب بھی ایسی نہ تھی جس کو فورٹ ولیم کالج کے نصاب میں شامل کیا جاتا اور چھپی ہوئی کتاب کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ اردو نثر کی جو گنی چنی کتابیں تھیں وہ سب قلم سے لکھی ہوئی تھیں۔ اور اس وجہ سے گمنام تھیں۔ گل کرائسٹ نے اردو نثر کا سب سے پہلے لٹریچر پیدا کیا۔ ہندوستان کے اہل علم لوگوں کو جمع کیا اور کتابیں لکھوائیں۔ ان کی زیر نگرانی تقریباً ساٹھ کتابیں لکھی گئیں۔

گل کرائسٹ نے جن ادیبوں سے علمی اور ادبی کام لئے ان کی علمیت اور ادبیت کا لوہا آج بھی مانا جاتا ہے۔ میر امن دہلوی، بہادر علی حسینی، مظہر علی ولا، شیر علی افسوس، نہال چند لاہوری، للولال جی وغیرہ اسی چمنستان اور ادب کے سدا تازہ رہنے والے پھول ہیں جس کی آبیاری گل کرائسٹ نے کی۔ گل کرائسٹ نے ان ادیبوں کی ہر طرح سے حوصلہ افزائی کی ان کی خدمات کا زیادہ سے زیادہ معاوضہ دلایا۔ انہیں انعامات دلانے کے لئے کالج کونسل سے لڑائی جھگڑے تک کئے۔ گل کرائسٹ نے جو کتابیں تصنیف و تالیف اور ترجمہ کرائیں ان میں سے بہت سی کتابیں شائع بھی نہیں ہو سکیں اور ان کے قلمی نسخے آج بھی انڈیا آفس لائبریری رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن اور نیشنل لائبریری کلکتہ کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ میر امّن کی کتاب "باغ و بہار" حیدر بخش حیدری کی "طوطا کہانی" میر شیر علی افسوس کی "آرائش محفل" میر بہادر علی حسینی کی "اخلاق ہندی اور مظہر علی خاں ولا کی "بیتال پچیسی" وہ کتابیں ہیں جن کے نام سے ہم سب لوگ واقف ہیں اور اردو زبان و ادب کی تعلیم میں جن کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ تعلیمی اداروں میں آج بھی یہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ ان کتابوں نے اردو ادب میں انقلاب برپا کر دیا اور اردو نثر جو فارسی اور عربی کے الفاظ کے استعمال کی وجہ سے ترقی نہیں کر پا رہی تھی، یکایک اسے آگے بڑھنے اور پھلنے پھولنے کا راستہ مل گیا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ سارا کارنامہ گل کرائسٹ نے صرف چار سال کے عرصے میں انجام دیا۔ جس کے بعد وہ کالج سے مستعفی ہو کر ہندوستان سے رخصت ہو گیا۔ اس کے وطن ایڈنبرا میں اس کا شاندار استقبال ہوا اور ایڈنبرا کی یونیورسٹی نے اس کی علمی خدمات کے اعتراف میں اسے ال ال ڈی کی اعزازی سند عطا کی جس کے بعد اسے ڈاکٹر گل کرائسٹ لکھا جانے لگا۔ یہ تھی کہانی اس نوجوان کی جو ہندوستان میں دولت کی تلاش میں آیا تھا لیکن ایک ایسی دولت حاصل کر کے لوٹا جسے کبھی زوال نہیں۔

نوٹس بورڈ

اگر آپ آنکھ مچولی میں لکھتے ہیں یا لکھنا چاہتے ہیں تو درجِ ذیل باتیں ضرور پڑھ لیجئے۔

آنکھ مچولی میں تمام تحریریں اپنے معیار کے مطابق نمبر آنے پر شائع ہوتی ہیں۔

آنکھ مچولی میں (سوائے "قلم قبیلے" کے) تمام شائع ہونے والی تخلیقات کا معاوضہ دیا جاتا ہے

نقل شدہ تحریروں، انتخاب، اقوال وغیرہ کا کوئی معاوضہ نہیں دیا جاتا۔

آپ تحریریں بھجوانے سے قبل یہ اطمینان ضرور کرلیں کہ آپ کی ہر تحریر کے پیچھے آپ کا نام اور پتہ صاف صاف لکھا ہوا ہے۔

ایک کاغذ پر دو مختلف نوعیت کی تحریریں قابلِ قبول نہ ہوں گی۔

اپنی تحریروں کے بارے میں یا کچھ اور جاننے کے لئے جوابی لفافہ ضرور بھجوائیں۔

اپنی ہر تحریر کے ساتھ "ذاتی کوائف، قلم کار" کا کوپن ضرور منسلک کریں جو اس شمارے کے آخری صفحات میں موجود ہے۔

بارش

محمد شاہد

سورج..... چمک تو آسمان پر رہا تھا لیکن یوں لگتا تھا جیسے وہ سر پر پہنچ گیا ہو۔ گرمی سے کیا انسان، کیا چرند پرند سب کا بُرا حال تھا۔ گاؤں کے تمام برساتی نالے خشک ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ وہ تالاب بھی سوکھنے لگا جو سدا سال پانی سے بھرا رہتا تھا اور جس پر سارے گاؤں کا انحصار تھا۔ چلچلاتی دھوپ میں جب گرم ہوا کا جھونکا بدن سے ٹکراتا تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے آگ کے شعلے نے چھو لیا ہو۔ ہر جاندار کی نظریں آسمان پر لگی ہوئی تھیں۔ جب کوئی بادل کا آوارہ ٹکڑا تیرتا ہوا آجاتا تو گاؤں میں جشن کا سا سماں ہوتا مگر پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ آوارہ ٹکڑا ..... گرم ہواؤں کے دوش پر اڑا چلا جاتا اور لوگ مایوس ہو جاتے۔

اس دن بھی دوپہر کے وقت سیاہ بادل آسمان پر منڈلا رہے تھے..... مگر پھر بھی گرمی جسم کو جلا رہی تھی، اوپر سے یہ مصیبت ہوئی کہ ہوا تھم گئی، جس سے گرمی اور حبس بڑھنے لگا..... سانس لینے میں دشواری ہوتی تھی..... نواز دین کی دس سالہ بیٹی رضیہ بیٹھی گڑیا سے ڈیوڑھی میں کھیل رہی تھی اور ماں صحن میں لگے ہوئے برگد کے بوڑھے درخت کے نیچے گائے کو چارہ ڈالنے میں مصروف تھی، وہ ساتھ ساتھ کچھ بڑبڑا بھی رہی تھی۔

"اری..... او رجّو!!" اس نے رضیہ کو پکارا۔

"کیا ہے ماں ؟"

"جا کے دروازے سے دیکھ تیرا ابا تو نہیں آرہا..... !!"

"ابا کھیتوں میں گیا ہے ؟" رضیہ نے سامان سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ....." ماں ادھر ہی آنے لگی۔ اس کے ہاتھ چارے سے آلودہ تھے اور دوپٹہ سر سے ڈھلک کر کندھوں تک پہنچ گیا تھا۔

"پر اماں ..... ابا کھیتوں میں کیوں جاتا ہے، بارش جو نہیں ہوتی ؟"

"کھیت دیکھنے گیا ہے تیرا ابا....." ماں نے گہرا سانس لیا۔ "اب تو بارش کیلئے انسان اور جانور سبھی سسک رہے ہیں۔" وہ چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"پر اماں دیکھنا..... اس سال بھی بارش نہیں ہوگی !" وہ چلتی ہوئی ماں کے نزدیک آگئی۔

ماں نے خونخوار نظروں سے اس کی طرف دیکھا..... "تیرے منہ میں خاک ....."

"جو بھی کہہ دے ماں ..... پر میں جھوٹ نہیں بول رہی۔" وہ ماں کے ساتھ بیٹھ گئی.....

"ایسے بدفال مت نکالا کر اپنے منہ سے ....." ماں بڑبڑائی۔

"کیوں ..... ؟"

"بس بس ..... اب چپ بھی ہو جا۔" ماں جھنجھلا اٹھی۔ "تیری تو زبان ہر وقت قینچی کی طرح چلتی رہتی ہے....."

"پھر کیا کروں ..... ؟؟"

"دعا مانگا کر، دعا..... اللہ میاں بچوں کی سنتا ہے۔"

"سنتا ہوگا ....." وہ لاپرواہی سے بولی۔ "میں نے جب بھی دعا مانگی اللہ میاں خاموش رہا....."

"ہائے ! توبہ توبہ ....." ماں کانوں کو ہاتھ لگا کر بولی۔ "کونسی دعا نہیں سنی اللہ میاں نے ؟؟"

رضیہ نے گھوم کر ماں کے چہرے کی طرف دیکھا..... تو اسے ہنسی آگئی مگر اس نے ہنسی ضبط کرلی ..... کانوں کو ہاتھ لگانے سے چارے کا سبز ملغوبہ ماں کے چہرے پر لگ گیا تھا۔

"میں نے کہا..... اللہ میاں ..... مجھے اچھی سی، پیاری سی گڑیا لادے، میں تو اس پرانی گڑیا سے کھیلتے کھیلتے تنگ آگئی ہوں....."

"تو پھر کیا ہوا ..... ؟؟"

"ہونا کیا تھا..... رات کو میں دعا مانگ کر سو گئی کہ اللہ میاں جب میں صبح اٹھوں تو میرے سرہانے

گڑیا پڑی ہوئی ہو۔"

"ہائیں..... یہ بھی کوئی دعا ہوئی!" ماں حیرانی سے بولی۔

"پر۔ اماں قبول تو نہیں ہوئی..... ناں.....!" وہ اداس ہوگئی۔

"پتا نہیں تجھے کیا ہوگیا ہے۔!" ماں کے لہجے میں اکتاہٹ تھی۔

رضیہ خاموشی سے فرش کو گھورنے لگی..... وہ کچھ سوچ رہی تھی۔

"اماں.....!"

"کیا ہے.....؟"

"اگر میں بارش کیلئے دعا مانگوں تو قبول ہوجائے گی کیا؟"

"ہاں ہاں..... کیوں نہیں! آسمان والا بچوں کی ضرور سنتا ہے۔"

"پر..... بارش کا ہم کریں گے کیا؟؟"

"ہائے ہائے..... پاگل ہوگئی ہے کیا؟" ماں اس کی طرف دیکھنے لگی۔ "اگر بارش نہ ہوئی تو کھائیں گے کہاں سے؟"

"بارش کے ساتھ کھانا اترتا ہے کیا۔؟" وہ ہنسنے لگی..... خود اسے بھی اپنی بات پر ہنسی آگئی تھی۔

"چل بے شرم....." ماں نے اسے ہاتھ سے دھکیلا۔ "بارش ہوگی تو فصل بھی ہوگی..... ورنہ زمین بنجر ہی پڑی رہے گی....." پھر ماں اداس ہوگئی۔ "تیرا ابا بڑا پریشان ہے..... پچھلے سال کا غلہ اب ختم ہونے کو ہے۔" ماں نے گہرا سانس لیا..... پھر وہ اٹھی اور کام میں جُت گئی۔

رضیہ ماں کی اداسی دیکھ کر خود بھی اداس ہوگئی... ماں ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی اگر بارش نہ ہوئی تو وہ کھائیں گے کہاں سے؟.....

وہ سوچنے لگی..... میں دعا مانگوں تو اللہ میاں سن لے گا کیا.....؟ کیا میرے کہنے پر بارش آجائے گی ..... نہیں..... نہیں..... ایسا نہیں ہوسکتا..... مگر دعا مانگنے میں حرج ہی کیا ہے..... ماں خود ہی تو کہتی ہے کہ بچوں کی دعا قبول ہوجاتی ہے۔"

وہ کچھ سوچ کر اٹھی اور باہر جانے لگی۔

"کہاں جارہی ہے رَجّو؟؟" ماں نے کہا مگر یہ فقرہ رضیہ کے کانوں تک نہ پہنچ سکا..... وہ جلدی سے باہر نکل گئی..... اس کا رخ کھیتوں کی طرف تھا۔

"کیوں نا عاشی، افضل اور وینا کو بھی بلالوں۔" یہ سوچ کر وہ اچھل پڑی..... اس نے عاشی کو بلا کر افضل کی طرف بھیج دیا اور خود وینا کو بلانے چل پڑی..... تھوڑی دیر بعد وہ چاروں ایک جگہ اکٹھے ہوگئے۔

رضیہ نے ان کو اپنے دل کی بات سے آگاہ کیا۔

"دعا مانگیں گے کہاں؟" افضل اچانک پوچھ بیٹھا۔

"آں ....." رضیہ سوچنے لگی۔ "کھیت کیسے رہیں گے!!"

"وہاں تو گرمی ہوگی۔" وینا نے اعتراض کیا۔

"کوئی بات نہیں، اللہ میاں کو رحم بھی تو جلد آئے گا۔" یہ بات رضیہ نے کہی تھی۔

"پر..... مجھے تو سرے سے دعا مانگنی ہی نہیں آتی!!" عاشی نے گویا انکشاف کیا۔

"لو..... یہ بھی کوئی بات ہوئی!..... میں بتادوں گا تجھے کہ کیسے مانگی جاتی ہے دعا۔" افضل چٹکی بجا کر بولا۔

وہ چلتے چلتے کھیتوں میں پہنچ گئے تھے جہاں ہر طرف جنگلی گھاس اور خودرو جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ جو تھوڑی بہت فصل تھی وہ گرمی کی شدت سے کُملا گئی تھی..... کھیت ویران پڑے تھے..... پرندے بھی کہیں غائب ہوگئے تھے۔

وہ چاروں دائرے کی شکل میں بیٹھ گئے..... گرمی سے ان کا بُرا حال تھا..... پسینے سے ان کے کپڑے مکمل طور پر بھیگ گئے تھے.....

"کاش! ہمارے کپڑے بارش سے بھیگ گئے ہوتے۔" عاشی بڑبڑائی۔

پھر رضیہ اٹھی اور ان کے درمیان بیٹھ گئی۔

"پر..... تو دعا مانگے گی کیسے!!" افضل کے لہجے میں بیزاری تھی۔ "میں تو کہتا ہوں..... گھر چلتے ہیں..... اگر بارش کو ہونا ہوتا تو کب کی ہو چکی ہوتی..... میرے دادو کی تو نفل پڑھتے پڑھتے ناک گھس گئی..... مگر بارش نہ ہوئی۔"

"تیرے دادو کوئی بچے تھوڑی ہیں کہ ان کی دعا قبول ہوتی!!" وینا نے تنک کر احتجاج کیا..... "میری اماں کہتی ہے..... اللہ میاں سب سے ناراض ہو سکتا ہے..... پر بچوں سے ناراض نہیں ہو سکتا۔"

"وینا!" رضیہ نے آنکھیں نکالیں۔

"اچھا بابا اچھا! میں نہیں بولتی.....!" اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔

"اور افی تم....." رضیہ نے افضل کی طرف دیکھا۔

"ناں بھئی ناں..... ہمارے تو فرشتے بھی نہیں بولیں گے۔!" اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

رضیہ نے ہاتھ اٹھائے اور کہنے لگی۔ "جو کچھ میں کہوں، تم بھی وہی کہنا۔"

"ٹھیک ہے۔" انہوں نے بیک آواز ہو کر کہا۔

چند لمحوں کیلئے خاموشی چھا گئی..... ان سب کی آنکھیں بند تھیں..... گرمی کی وجہ سے ان کے چہرے سرخ ہو گئے تھے اور پسینہ بارش کے قطروں کی طرح ٹپ ٹپ گرنے لگا۔

"اے مہربان اللہ میاں..... اے اچھے اللہ میاں!" رضیہ نے سکوت توڑا۔ سب نے مل کر رضیہ کے الفاظ دہرائے۔

ان کے ہونٹوں پر پپڑی جمنے لگی اور حلق خشک ہو گئے..... وہ پسینے میں شرابور ہو چکے تھے..... آنکھوں کو بند کئے، سروں کو جھکائے اور ننھے ننھے ہاتھ پھیلائے اپنے خالقِ حقیقی سے بارش مانگتے رہے.....

لو چلتی رہی، آگ برستی رہی۔ حتیٰ کہ دن بھر دھرتی کو جلانے والا سورج مغرب کے غاروں میں روپوش ہو گیا۔ بچوں کی آس ناامیدی میں بدل گئی دل خون خون ہو گیا۔ انہوں نے بے معنی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کچھ بولے بغیر تھکے تھکے قدموں سے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

رات گہری ہوتی جا رہی تھی مگر نیند آج رضیہ کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ دیئے کی مدھم لو میں وہ دھوئیں سے کالی ہو جانے والی چھت کو مسلسل گھورے جا رہی تھی۔ اس کے کانوں میں اماں کی آواز گونج رہی تھی۔ جو کہتی تھی کہ اللہ میاں بچوں کی دعا ضرور سنتا ہے۔ مگر آج رضیہ نے دیکھ لیا تھا کہ اللہ میاں نے اس کی دعا قبول نہیں کی تھی۔ اللہ میاں نے پہلے بھی اس کی دعا قبول نہیں کی تھی اور اسے کبھی بھی گڑیا لا کر نہیں دی تھی۔ اپنی فرمائشوں کے پورا نہ ہونے پر اس کا دل بھر آیا۔ اس نے کرب سے سوچا۔" اللہ میاں میری دعا کیوں نہیں سنتا کیوں آخر کیوں؟"

آنسو اس کی بند آنکھوں کے کناروں سے بہہ کر رخساروں اور گردن سے ہوتے ہوئے تکیئے میں جذب ہوتے رہے اور نجانے اس عالم میں کب اسے نیند آ گئی۔

صبح وہ دیر سے بیدار ہوئی۔ کمرے سے باہر نکلی تو گھر کا کچا صحن تالاب کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ اور گاؤں والوں کی خوشی سے بھرپور آواز کا شور۔ بادل بہت ٹوٹ کر برسا تھا لیکن رضیہ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ یہ اس کی دعاؤں کا اثر تھا یا آنسوؤں کی تاثیر بے اختیار اس کی نظر آسمان کی طرف اٹھ گئی۔

جہاں بادلوں کی اوٹ سے مسکراتا ہوا سورج اسے دیکھ رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔ "اللہ میاں بچوں کی دعا ضرور سنتا ہے۔"

ایک بھرپور اور پُر سکون مسکراہٹ خود بخود اس کے چہرے پر پھیل گئی۔

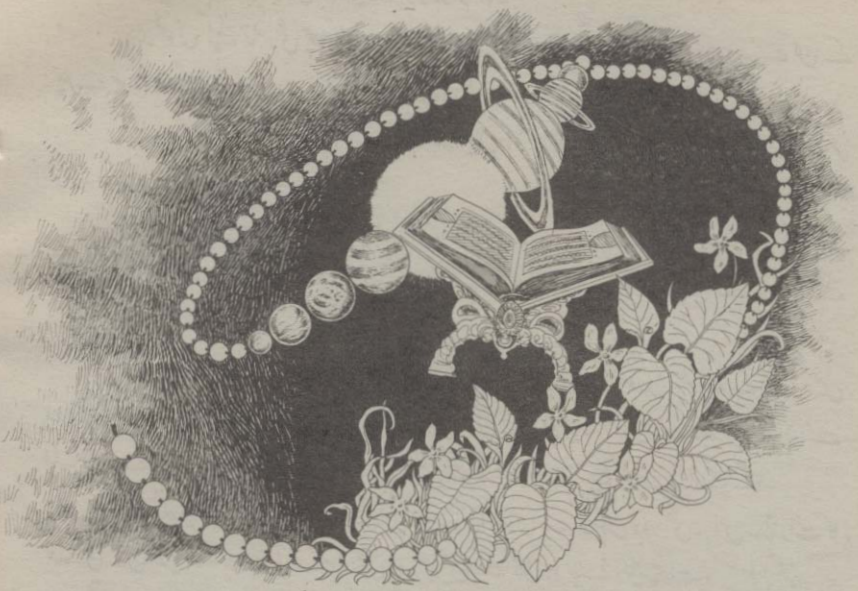

آخرت کیوں ضروری ہے؟

ابن بلوچ

آخرت کی تیسری دلیل دن کی روشنی کی طرح واضح اور سورج کے وجود کی طرح ثابت ہے۔ دیکھئے، اس دنیا کی ہر چیز جوڑا جوڑا ہے۔ وہ چیزیں جو نظر آتی ہیں اور وہ بھی جو نظر نہیں آتیں۔ جانداروں میں نر اور مادہ تو واضح ہیں۔ لیکن ذرا غور کریں تو معلوم ہو گا کہ یہ اصول اس دنیا کی ہر چھوٹی اور بڑی چیز پر پورا اترتا ہے۔ سچ اور جھوٹ خوبصورتی اور بد صورتی، بلندی اور پستی، دن اور رات خوشبو اور بدبو، تری اور خشکی، خزاں اور بہار امیری اور غریبی..... غرض سائنس اور فلسفہ دونوں اس اصول کے آگے سر جھکائے نظر آتے ہیں۔ اس اصول کے تحت اس دنیا کی زندگی کا جوڑا آخرت کی زندگی

ہے۔ عارضی زندگی آخرت کی ہمیشگی کے ساتھ مکمل ہوگی۔ پچھلی دونوں دلیلوں کی طرح یہ دلیل بھی اس کائنات کے مالک نے قرآن میں بیان کی ہے، جس کا توڑ نہ ابھی تک ہوا ہے اور نہ ہونا ممکن ہے!!

ان تینوں دلائل کے بعد قرآن مجید نے آخرت کے عقیدے کے متعلق یہ بھی کہا ہے کہ اللہ نے اس آخرت کے لئے زندگی کو وجود بخشا ہے۔ سورہ ملک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اس نے زندگی اور موت اس لئے پیدا کئے کہ وہ انسانوں کو آزما سکے کہ ان میں کون اچھے ہیں اور کون برے۔ تاکہ وہ جنت کو زمین کی طرح برائی کی جگہ نہ بنا سکیں جہاں اب صرف نیک اور شریف انسان رہ سکیں گے۔

آخرت کی اہمیت کا اندازہ آپ اس بات سے بھی کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام رسولوں اور انبیا کو یہی پیغام دے کر بھیجا کہ وہ انسانوں تک اللہ کے اس منصوبے کو پہنچا دیں کہ اس کی رحمت نے انسانوں کو زندگی تو بخش دی ہے لیکن اس کے عدل کا تقاضا ہے کہ وہ اس زندگی میں ناشکری اور ظلم کا رویہ رکھنے والوں کو سزا دے، چنانچہ اس نے اپنی قدرت کے ذریعے سے جنت اور دوزخ کی تخلیق کی۔ آخرت کا یہی فلسفہ اسلام کی روح ہے۔ اور اسی نظریئے کی وجہ سے اس دنیا میں معقولیت پیدا ہوتی ہے۔ ورنہ اس کائنات کا کوئی مقصد نہیں، کوئی مطلب نہیں۔

آخرت کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ انسان نے پتھر کے زمانے سے لے کر آج کے جدید دور تک کے سفر میں اسی چیز کو ثابت کیا ہے کہ جنت اس کی سب سے بڑی خواہش اور سب سے بڑی تمنا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنی زندگی کو خوش گوار اور پر آسائش بنانے کی دوڑ میں لگا رہا ہے۔ پہیے کی ایجاد سے لے کر مریخ و زہرہ پر کمند ڈالنے کی ترقیاں، سب اس دنیا کی زندگی کو جنت بنانے کے عزم کا اظہار ہے۔ اس منزل کو پانے کے لئے اس نے بے پناہ قربانیاں دیں ہیں۔ ہوا میں اڑنے کے لئے معلوم نہیں کتنے انسانوں کو اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھونا پڑا۔ بہتر سے بہتر بستیوں اور ملکوں کی تلاش میں ان گنت انسانوں نے سفر کی تکالیف برداشت کیں۔ جنگلی جانوروں کو سدھانے کی مہم سے لے کر قدرت کے قوانین کو رام کرنے کی جدوجہد..... وہ پرامن، پرسکون اور پروقار زندگی کے حصول کے لئے اپنا سب کچھ نچھاور کرتا رہا۔ انسان کی یہ خواہش اتنی شدید اور اتنی مضبوط تھی کہ اس نے اپنی آنکھوں اپنے کانوں اور اپنی حاتوں کی محدودیت کو ختم کر دیا۔ وہ آج ہزاروں میل دور ہونے والے واقعے کو اپنے کمرے میں بیٹھے دیکھ سکتا ہے۔ ایک براعظم میں بیٹھا شخص دوسرے براعظم میں موجود دوست سے بات چیت کر سکتا ہے۔ پہاڑوں کو ایک بٹن دبا کر ریزہ ریزہ کر سکتا ہے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ پلک جھپکتے میں پہنچنے کی خواہش نے اسے کاروں، ٹرینوں، جہازوں اور راکٹوں پر بٹھا دیا ہے۔ انسان کی یہ ساری جدوجہد، اس کی یہ ساری کامیابیاں

پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ وہ جنت کی تلاش میں ہے۔ ایسی جگہ کی جستجو میں جہاں نہ درد ہو نہ دکھ، نہ فساد ہو نہ جنگ، نہ غربت ہو نہ تنگی، نہ دشمنی ہو نہ نفرت، نہ روک ہو نہ ٹوک، نہ غلامی ہو نہ مجبوری..... لیکن کیا یہ سب کچھ حاصل کرنے کے باوجود اس نے ان تمناؤں اور ان خواہشوں کو حاصل کر لیا ہے؟ طوفان، سیلاب، زلزلے اور دوسری آسمانی آفات آج بھی اس کے سر پر لٹکتی تلوار کی طرح ہیں۔ جسمانی بیماریوں پر قابو پانے کی اس نے بہت کوششیں کیں لیکن وہ چند بیماریوں پر قابو پانے میں کامیاب ہوا تو بہت سی نئی بیماریاں اس کی بے بسی کا مذاق اڑا رہی ہیں۔ ہیضہ اور ٹی بی کا علاج ڈھونڈ نکالا تو کینسر اور ایڈز نیا چیلنج بن گئیں۔ اپنی طاقت اور توانائی بڑھانے کے لئے بجلی کا سہارا لیا لیکن وہ منہ زور بد کا ہوا گھوڑا ثابت ہوئی۔ ذرا سی بد احتیاطی کی سزا موت سے کم دینا اس کی شان کے خلاف ہے۔ زندگی کی سہولتوں کے لئے فیکٹریاں، ملیں کارخانے بنائے لیکن ان کی آلودگی آج اس کے لئے سب سے بڑا خطرہ بن چکی ہے۔ اتنا بڑا خطرہ کہ وہ اس پوری زمین کے لئے موت کا پیغام لا سکتی ہے اور پھر سب سے بڑھ کر اس دنیا کی سب سے بڑی مصیبت، سب سے بڑا المیہ، سب سے بڑا چیلنج اور سب سے بڑی زنجیر اب بھی اس خوفناک اور سنگ دلی سے موجود ہے۔ بلکہ اس زنجیر کی گرفت میں مزید سختی آگئی ہے، یعنی موت۔ انسان اس کا کوئی علاج نہیں کر سکا۔ یہ موت صرف اس کی زندگی کا انجام نہیں بلکہ اس دنیا میں پائے جانے والی ہر چیز اور خود اس زمین کا بھی حشر اب سائنس کی ایک ثابت شدہ حقیقت بن چکی ہے۔ غرض اس دنیا میں جنت حاصل ہی نہیں کی جا سکتی۔ یہاں تو ہر سکھ کے ساتھ ایک دکھ لگا ہوا ہے، ہر ایجاد کی سہولت کے اوپر موت کی تلوار لٹک رہی ہے، ہر پھول کی قیمت میں کانٹا برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے یا تو انسان مایوس ہو کر خود اپنے ہاتھوں اپنی زندگی ختم کر لے یا اس حقیقت کو مان لے کہ پیاس کے لئے پانی، بھوک کے لئے کھانا، آرام کے لئے نیند اور اس کی زندگی کی ہر ضرورت مہیا کرنے والے پروردگار نے اس کے لئے جنت بھی بنائی ہے۔ موت پیدا کرنے والے کے پاس ہی ابدیت اور ہمیشگی کی خوش خبری ہوگی۔ سچی بات تو یہ ہے اسلام نے موت کے بعد زندگی کا جو تصور دیا ہے، اس کے بغیر اس دنیا کی زندگی کا کوئی مقصد نظر نہیں آتا۔ اس زندگی کا معمہ انسان یہی حل کر پاتا ہے، جب وہ آخرت کو اس کا حل تسلیم کر لے۔ عقلمند انسان کے لئے اس سے بڑھ کر آخرت کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے!!

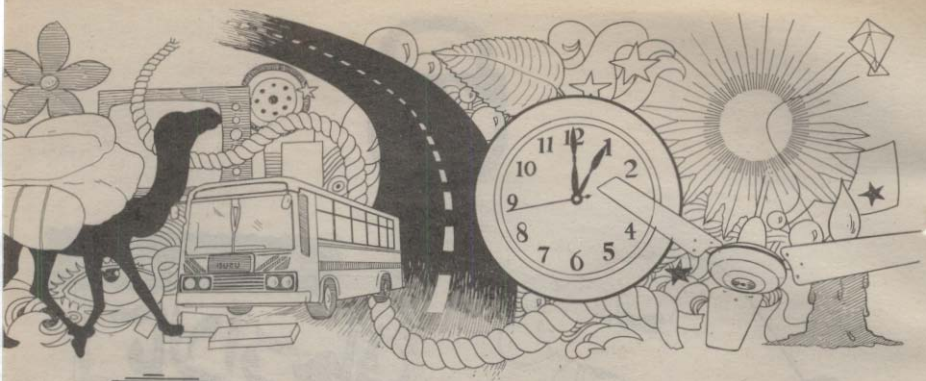

پہیلیاں بوجھیے

۱.....

صحن میں پھیلی اُجلی چادر
کوئی داغ نہ دھبّا جس پر
چاہیں تو سر پر بھی تانیں
اس پر پیر دھریں تب جانیں
(اتا پتہ۔ سب کی دیکھی بھالی)

۲.....

چھوڑ کر مجھ کو وہ گئی دیکھو
بھائیو میری بے بسی دیکھو
(اتا پتہ۔ پہیلی میں نام موجود)

۳.....

جاتی ہے بن رکھے پاؤں
گاؤں سے شہر اور شہر سے گاؤں
چلتی شہر میں بھی پیہم
دن میں زیادہ رات میں کم
(اتا پتہ۔ کوئی پکی کوئی کچی)

۴.....

چلتی ہے رات دن کسی لمحے کھڑی نہیں
یہ بات دیکھی بھالی ہے میں نے گھڑی نہیں
(اتا پتہ۔ کام کی چیز)

۵.....

کیوں نہ ہو شہر میں بدنام بھلا
اون میں ٹاٹ کا پیوند لگا
(اتا پتہ۔ پہیلی میں نام چھپا ہے)

۶.....

بھرے فراٹا پر پھیلائے
پھر بھی کہیں آئے نہ جائے
(اتا پتہ۔ کام کی اور آرام کی چیز)

جوابات اسی رسالے میں تلاش کیجیے!

چیزوں کی کہانی

تالا اور چابی

آصف فرخی

تالے کا کام حفاظت ہے۔ زیور ہو یا نقدی، گھر بار ہو یا دفتر اور دکان، لوگ اپنی قیمتی چیزیں بڑی خوشی سے اس کے پاس چھوڑ جاتے ہیں۔ تالا، بند ہو کر ان کی نگرانی کرتا رہتا ہے۔ کسی غلط ہاتھ کو ان تک پہنچنے نہیں دیتا۔ یوں تالا محافظ بھی ہے اور راز دار بھی۔ تالا ایک بار بند ہو جائے تو خود بند ہونے کے ساتھ ساتھ جس چیز یا جگہ پر لگ جاتا ہے اسے بھی بند کر دیتا ہے۔ مگر تالے کا کام ادھورا ہے۔ ایک دفعہ بند ہو جائے تو اپنے آپ کھل نہیں سکتا۔ ہر تالے کو چابی کی ضرورت ہوتی ہے۔ چابی نہ ہو تو تالا کھلے کا کھلا اور بند کا بند رہ جائے۔

ابتدائی دور کے انسان کو اپنی چیزیں تالوں میں رکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ چیزیں بھی تھوڑی تھیں، اور ان کی ملکیت کسی ایک شخص تک محدود نہ تھی۔ جو تھا وہ سب کے لئے تھا، کسی ایک کا نہ تھا۔ جب ملکیت کا تصور سامنے آیا تو پھر اس بات کی ضرورت بھی پڑنے لگی کہ چیزوں کو اس طرح رکھا جائے کہ وہ دوسروں کی پہنچ سے باہر رہیں۔

جب تالا اور چابی ایجاد نہ ہوئے تھے تو چیزوں کی حفاظت کے لئے لوگ ان کو چھپا کر رکھا کرتے تھے۔ گھاس پھوس اور درختوں کی کھوہ میں چیزوں کو رکھا جاتا تھا کہ کسی دوسرے کی نظر نہ پڑے، اور جس نے انہیں وہاں رکھا ہے اس کا جب جی چاہے، آکر نکال لے۔ چیزوں کے ساتھ ساتھ اپنی حفاظت بھی ضروری تھی۔ اس دور کے لوگ جن غاروں میں رہتے تھے۔ ان غاروں کے دھانے پر بھاری پتھر رکھ لیتے تھے تاکہ جنگلی جانور اور دشمن اندر نہ آسکیں۔

جب لوگوں نے گھروں میں رہنا شروع کیا تو

اپنی حفاظت کے لئے لکڑی کے شہتیر استعمال کرنے لگے۔ دروازے کی پشت پر شہتیر لگا دیئے جاتے تو وہ باہر سے کھل نہیں سکتا تھا۔ اس میں مشکل صرف اتنی تھی کہ یہ ترکیب اس وقت کام دیتی تھی جب آپ خود گھر کے اندر ہوں۔ باہر جاتے ہوئے دروازہ کھلا رہتا تھا۔

جلد ہی اس شہتیر کی جگہ لکڑی کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے نے لے لی اور دروازے میں ایک چھوٹا سا سوراخ کر کے اس میں رسی یا دھاگا ڈال دیا گیا جس کی مدد سے لکڑی کو آگے پیچھے کر کے کھولا یا بند کیا جا سکتا تھا۔ یہ کنڈی کی پہلی شکل تھی۔

اس اصول کے تحت لکڑی کے تالے قدیم مصر اور یونان میں عام استعمال ہوتے تھے۔ ان تالوں کو اس طرح بنایا جانے لگا کہ وہ چابی سے کھلیں اور بند ہو جائیں۔ جلد ہی لوگوں کو احساس ہو گیا کہ چابی کتنی اہم ہے اور کتنی بڑی علامت ہے۔ یونان میں لوگ بڑی بڑی چابیاں ساتھ لے کر گھوما کرتے تھے کہ دیکھنے والوں پر یہ تاثر پڑے کہ اس شخص کے پاس بہت مال و دولت ہے۔

دھات کا بنا ہوا تالا پہلی بار روم میں استعمال ہوا۔ روم کے بنے ہوئے تالوں میں چابی کے لئے سوراخ ہوتا اور چابی بھی دھات کی ہوتی۔ چابی کے دندانے اس طرح بنائے جاتے کہ تالے کے سوراخ میں برابر بیٹھیں، تاکہ تالا صرف صحیح چابی سے ہی کھل سکے۔ اس طرح کے تالے اور چابیاں آج تک استعمال میں ہیں۔

ادھر روم میں تو تالے لگ رہے تھے اور ان کے لئے چابیاں بنائی جا رہی تھیں، لیکن دوسرے معاشروں میں چیزوں کی حفاظت کے لئے دوسرے طریقے رائج تھے۔

جان و مال کی حفاظت کے لئے وہ لوگ دوسرے طریقے اختیار کرتے۔ بعض لوگ اپنے گھر ایسی جگہوں پر بناتے کہ وہاں تک پہنچنا آسان نہیں تھا۔

امریکہ کے پاہلو انڈین باشندے چٹانوں پر رہتے تھے اور ان مکانوں میں داخلے کا واحد راستہ سیڑھی کے ذریعے سے تھا۔ رات کے وقت اس سیڑھی کو اوپر کھینچ لیا جاتا۔ یوں سمجھئے کہ اب پوری بستی کو تالا لگ گیا۔ ان کے برخلاف قدیم میکسیکو کے آزٹیک باشندوں کا دستور نرالا تھا۔ ان کے گھروں پر دروازے نہیں ہوتے تھے، اور وہ کہیں جاتے ہوئے ایک چھڑی باہر رکھ جاتے تاکہ آنے والوں کو پتہ چل جائے کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔ اس چھڑی کا مقصد حفاظت نہیں تھا بلکہ اطلاع دینا تھا۔

ایک صوفی بزرگ کے بارے میں روایت بیان کی جاتی ہے کہ گھر سے باہر کہیں جاتے تو دروازے کھلے چھوڑے جاتے اور اندر ہوتے تو دروازے میں تالا لگا لیتے۔ لوگوں نے ان سے اس کا سبب پوچھا۔ انہوں نے جواب دیا کہ اس گھر میں سب سے قیمتی چیز تو میں خود ہوں، میرا علمی اثاثہ ہے جسے

چوروں سے بچانا ضروری ہے اگر میں موجود نہیں ہوں، تو جو گھر میں داخل ہوگا تو اسے کچھ ملے گا ہی نہیں کہ چرا سکے۔

ازمنہ وسطیٰ کے یورپ میں لوگوں کو اپنے گھر اور ساز و سامان کی حفاظت کی بہت ضرورت رہتی۔ شہر قلعہ بند تھے اور قلعے کے گرد فصیلیں تھی۔ رات کے وقت فصیل کے پھاٹک بند کر کے ان میں بھاری قفل لگا دیئے جاتے۔ ان تالوں کی چابیاں صرف خاص اور اہم لوگوں کے پاس رہتی تھیں۔ آج شہر میں نہ فصیلیں ہیں نہ شہر کے دروازے، لیکن یہ دستور باقی ہے کہ باہر سے آنے والے کسی مہمان کی عزت افزائی کے لئے اسے شہر کے دروازے کی چابی پیش کی جاتی ہے۔

جوں جوں زمانہ ترقی کرتا گیا تالے بہتر سے بہتر اور مشکل سے مشکل ہوتے گئے۔ لوگ اپنی قیمتی چیزوں کی حفاظت کے لئے طرح طرح کی ترکیبیں استعمال کرنے لگے۔ قدیم مصر کے فرعون، جس اہرام میں دفن ہوتے تھے اس میں اپنی دولت کی حفاظت کے لئے ایسے طریقے استعمال کرتے تھے کے لٹیرے اس تک پہنچ نہ سکیں۔ عمارت میں بھول بھلیاں، خفیہ راستے اور چور دروازے بنائے جاتے تھے۔ ازمنہ وسطیٰ کے یورپ میں محل اور قلعے بھی اس طرح تعمیر کئے جاتے کہ ان میں چھپنے اور چھپانے کی جگہیں موجود ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ تالوں کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ بعض تالے ایسے تھے جو ایک خفیہ گھنڈی کو دبانے سے کھلتے تھے اور ایسے تالے بھی تھے جو زہر میں بجھے ہوئے ہوتے کہ کسی غلط آدمی کا ہاتھ لگ جائے تو اس کو زہر چڑھ جائے۔ آہن گر بڑی مہارت سے نت نئے قسم کے تالے بناتے۔ یوں بھی تالے بنانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

تجوریوں اور صندوقوں میں ڈالے جانے والے موٹے قفل سے لے کر چھوٹے تالوں تک، ہزاروں طرح کے تالے بنائے جا چکے ہیں۔ تالے بنانے میں آج کے دور میں جو سب سے اہم پیش رفت ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ بینک یا عجائب گھر میں سیف پر جس قسم کے تالے لگائے جاتے ہیں وہ ایک خاص نمبر یا ابجد پر ہاتھ لگانے سے کھلتے ہیں۔ اگر آپ نے صحیح ہندسے نہیں گھمائے تو قفل نہیں کھلے گا۔ ان تالوں میں چابی کی جگہ ابجد نے لے لی ہے۔

دلچسپ بات ہے کہ ہمارے ہاں ایسے تالے بھی بنتے تھے جن پر حروف لکھے ہوتے ہیں۔ ان کو قفل ابجد کہا جاتا تھا۔ ان حروف کو دبانے یا گھمانے سے تالا کھل جاتا تھا۔ مثلاً اگر قفل ابجد نام سے کھلنے والا ہے تو نام کے مجموعے سے قفل کھل جائے گا۔

ابجد کے حروف سے کھلنے والے اس قفل کا تصور بھی کتنا حیران کن ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ کائنات بھی اسی طرح کا قفل ہے۔ اور حروف ابجد سے اس کا سربستہ راز بھی ایک نہ ایک دن کھل جائے گا۔

انعامی لطیفہ

امتحانات کا زمانہ تھا ہوسٹل میں ایک لڑکے نے دوسرے سے پوچھا، "کل تم نے مجھ سے جو قمیض لی تھی، وہ کہاں ہے؟"
لڑکے نے کہا..... وہ دھلنے کے لئے لانڈری میں دے دی۔
"اوہ یہ تم نے کیا کیا۔" لڑکے نے سر پیٹ لیا۔
"پوری تاریخ ہندوستان تو اس کی آستینوں میں تھی۔"

نیلم پروین، پشاور

بارش میں بھیگتا ہوا ڈاکیا ایک آدمی کے گھر گیا اور آواز لگائی خط لے لو آدمی اندر سے نکلا اور بولا بھئی اتنی بارش میں آنے کی کیا ضرورت تھی خط ڈاک سے بھیج دیا ہوتا۔

(ریحان رسول، راولپنڈی)

..................○○..................

ایک انگریز ڈاکٹر نے عربی کے دو لفظ انشاء اللہ اور ماشاء اللہ یاد کئے لیکن اسے ابھی ان کا درست استعمال نہیں آتا تھا۔ سعودی ہسپتال میں ایک مریض کا ٹمپریچر دیکھ کر کہا ماشاء اللہ آپ کو تو

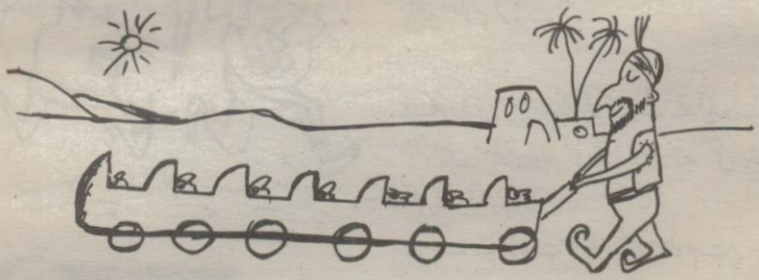

بہت تیز بخار ہے۔ مریض گھبرا کر بولا..... کیا اب میں مرجاؤں گا ڈاکٹر انشاء اللہ ضرور۔

.....○○.....

ایک بچہ گلی میں کھیل رہا تھا سامنے والے گھر سے ایک کتا آیا بچے کے پاؤں چاٹنے لگا بچہ روتا ہوا گھر آیا۔ ماں نے پوچھا "رو کیوں رہے ہو کہیں سامنے والوں کے کتے نے تو نہیں کاٹ لیا۔" بچہ بولا "نہیں ابھی تو صرف چکھ کر گیا ہے کاٹنے تو کل آئے گا۔"

.....○○.....

ایک بچے نے سانپ کبھی نہیں دیکھا تھا ایک دن جب وہ اپنے ابو کے ساتھ چڑیا گھر گیا تو ایک پنجرے میں سانپ کو رینگتا ہوا دیکھ کر بولا ابو یہ کیسی دم ہے جو بغیر کتے کے ہی چل رہی ہے۔

(ریحان رسول، راولپنڈی)

○..... ایک اسمگلر کسٹم کاؤنٹر پر پہنچا تو کسٹم آفیسر نے پوچھا "بیگ میں کیا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "مرغیوں کی خوراک"

مگر تلاشی لینے پر بیگ میں سے ریڈیو گھڑیاں اور دوسری قیمتی چیزیں نکلیں تو کسٹم آفیسر نے طنز یہ انداز میں پوچھا۔ "مرغیوں کی خوراک ہے۔"

اسمگلر نے جواب دیا۔ "میں انہیں مرغیوں کے آگے ڈال دیتا ہوں اگر نہ کھائیں تو بازار میں بیچ آتا ہوں۔"

.....○○.....

ماں نے بیٹے کو اخبار سناتے ہوئے کہا

"بھینس نے اسکول ماسٹر پر حملہ کر دیا"۔ بیٹا حیرت سے بولا "مگر امی جان بھینس کو پتہ کیسے چلا کہ یہ اسکول ماسٹر ہیں؟"

.....○○.....

مریض ڈاکٹر سے..... "کیا آپ کو اپنے اوپر بھروسہ ہے کہ آپ کامیابی سے آپریشن کر سکیں گے"۔

ڈاکٹر..... "یہی تو آپ کے آپریشن کے بعد مجھے معلوم کرنا ہے"۔

.....○○.....

دو کاروباری حضرات گفتگو کر رہے تھے ایک نے کہا "تمہیں معلوم ہے کسی اشتہار کا نتیجہ کتنی جلدی ظاہر ہو جاتا ہے؟"

دوسرے نے بتایا ہے "ہاں مجھے معلوم ہے پرسوں

میں نے اخبار میں گھر کے چوکیدار کی ضرورت کا اشتہار دیا کل ہمارے ہاں چوری ہوگئی"۔

.....○○.....

باپ (بیٹے سے)..... "میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ جب تم بی۔ ایس سی کا امتحان پاس کر لو گے تو میں تمہیں موٹر سائیکل خرید کر دوں گا۔ "مگر افسوس تم ناکام ہو گئے آخر سارا سال تم نے کیا کیا؟"

بیٹے نے جواب دیا "ابا جان! میں سارا سال موٹر سائیکل چلانا سیکھتا رہا۔"

.....○○.....

نیلم پروین، پشاور

وکیل..... میں تمہارا کیس لڑوں گا مگر یہ بتاؤ خرچ برداشت کر لو گے۔

ملزم..... میرے پاس تو صرف ایک سونے کا ہار ہے۔

وکیل..... خوب! خوب میری فیس کے لئے وہ کافی ہے مگر تم پر الزام کیا ہے۔؟

ملزم..... جناب وہی ہار چرانے کا۔

.....○○.....

..... ایک صاحب نے نئی نئی دکان کھولی۔ ایک گاہک نے آکر پوچھا۔ "بھائی لکس ہو گا؟"

دکاندار نے کہا۔ "نہیں۔"

"اچھا تو ریکسونا دے دو۔"

"وہ بھی نہیں ہے۔"

گاہک واپس چلا گیا۔ برابر کی دکان کا مالک یہ سب دیکھ رہا تھا اس نے کہا۔

"دکان داری ایسے نہیں ہوتی۔ اگر کوئی لکس مانگے اور تمہارے پاس نہ ہو تو اسے کیپری دے دو۔ ملتی جلتی چیزیں دے دینی چاہئیں۔" یہ نقطہ ان کے ذہن میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک آدمی آیا۔

"بھائی بلیڈ ہو گا؟"

"نہیں بلیڈ تو نہیں ہے۔ تم یہ ریگ مال لے

جاؤ۔" دوکاندار نے فوری جواب دیا۔

.....○○.....

استاد..... (بشیر سے) "تمہارا سن پیدائش کیا ہے؟"

بشیر..... جی ۱۹۶۶ ق ۔ ش

استاد..... یہ ق ۔ ش کیا ہے؟

بشیر..... جناب قبل شبیر کیونکہ میں اپنے چھوٹے بھائی شبیر سے پہلے پیدا ہوا تھا۔

"سسٹر کیا تم مجھے ایک گلاس پانی پلا سکتی ہو؟ مریض نے جس کے گلے کا آپریشن ہوا تھا نرس سے پوچھا۔ "کیا تمہیں پیاس لگی ہوئی ہے" نرس نے بے رخی سے پوچھا۔

"نہیں" مریض نے جل کر جواب دیا۔ "میں تو صرف یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ میری گردن لیک تو نہیں کر رہی۔"

مرسلہ سلطان اصغر..... سیالکوٹ

○..... علامہ اقبالؒ نے بچپن میں استاد کے املا لکھوانے پر "غلط" کو (غلت) لکھ دیا (یعنی ط کی جگہ ت لکھ دیا)

استاد صاحب نے املا دیکھی تو (غلت) دیکھ کر بولے

"برخوردار! غلط ہمیشہ ط سے لکھنا چاہئے۔"

علامہ اقبالؒ بولے..... "جناب محترم! غلط کو غلت ہی لکھا جائے تو ٹھیک ہو گا۔"

.....○○.....

○..... کانگریس سے علیحدگی کے بعد ایک روز حضرت مولانا ظفر علی خان بازار میں جوتوں کی ایک دکان پر کھڑے تھے کہ آپ کو سامنے سے کانگریس کا ایک جلوس آتا نظر آیا۔

مولانا ظفر علی خان نے فی البدیہہ یہ شعر ارشاد فرمایا

کانگریس آرہی ہے ننگے پاؤں
جی میں آتا ہے بڑھ کے دوں جوتا

کرشمہ

اظہر نیاز

قسط نمبر ۵

جواد ذیشان کا دوست تھا۔ وہ ایک حیرت انگیز صلاحیت کا مالک تھا جسے ذیشان کے ابو، آغا عمران نے چھٹی حس کا نام دیا تھا۔ جواد کو آنے والے خطرات کا پہلے سے علم ہو جاتا تھا اور اس حس کا مظاہرہ وہ اکثر کرتا رہتا تھا ایک بار اس نے اسکول میں اچانک یہ شور مچا کر کہ چھت گرنے والی ہے، پوری کلاس کو کمرے سے باہر نکال دیا اور واقعی تھوڑی دیر بعد چھت گر گئی۔ آغا عمران پولیس افسر تھے۔ جواد نے کئی کیسوں میں ان کی بھرپور مدد کی تھی۔ آج بھی وہ ذیشان سے ملنے آیا تو آغا عمران سے اس کی ملاقات ہو گئی جنہوں نے جواد کو خوش خبری سنائی کہ وہ حسب خواہش ٹی وی کے ڈراموں میں کام کر سکتا ہے۔ انہوں نے اسے اپنے ایک دوست ٹی وی پروڈیوسر کے نام تعارفی خط بھی دیا۔ مگر جواد نے انہیں جو بات بتائی اسے سن کر وہ ڈر سے گئے تھے۔ اس نے کہا تھا کہ آپ کی جان کو خطرہ ہے۔

آغا عمران دفتر پہنچے تو پہلا ٹیلی فون آئی جی صاحب کا تھا۔ انہوں نے ایک بہت اہم کیس ان کے حوالے کیا تھا اور اس کے بارے میں ضروری ہدایات اور ہر ممکن قانونی اختیارات بھی دیئے تھے۔ انسپکٹر شعیب کو ان کا مددگار بنایا گیا تھا جو ایک طرح سے آغا صاحب کے دست راست تھے۔ ..... جواد، آغا عمران کا خط لے کر اپنی امی کے ساتھ ٹیلی ویژن اسٹیشن پہنچا تو اس کی ملاقات پروڈیوسر انصاری صاحب سے ہوئی۔ آڈیشن میں جواد کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی اور انصاری صاحب نے اسے پیدائشی اداکار کا خطاب دیتے ہوئے ڈرامے کے لئے منتخب کر لیا جس میں اسے ایک چلڈرن کلب کے چیئرمین کا کردار کرنا تھا۔ انصاری صاحب سے رخصت ہونے سے قبل جواد نے ٹی وی اسٹیشن کو بجلی کی فراہمی کے ذرائع کے

بارے میں ایک غیر متوقع سوال کیا تو انصاری صاحب نے اسے بتایا کہ بجلی چلی جانے کی صورت میں جنریٹر استعمال ہوتا ہے۔ اور اگر وہ بھی خراب ہو تو ظاہر ہے اسٹیشن کا سارا کام رک جائے گا۔ جب جواد ان کے کمرے سے نکلا تو اچانک لائٹ آف ہوگئی۔ جنریٹر کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ بھی خراب ہے۔ انصاری صاحب نے سوچا، کیا یہ محض اتفاق ہے۔

آغا عمران نے اس فائل کا بغور مطالعہ کیا جس کی بنیاد پر انہیں اپنے نئے کیس کو حل کرنا تھا۔ اس بار انہوں نے ذرا مختلف انداز سے کام کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ انسپکٹر شعیب کو انہوں نے ایس ایس پی صاحب کی طرف بھیجا تھا تاکہ ان سے مشکوک افراد اور جگہوں کی ایک فائل لے آئیں۔ یہ کیس منشیات فروشوں کے سلسلے کا تھا۔ اطلاعات تھیں کہ موت کے سوداگروں نے اس بار بچوں کی زندگیوں سے کھیلنے کا پروگرام بنایا تھا اور اسکولوں کے اندر، اور باہر ایسی کھانے پینے کی چیزوں کی فروخت شروع کی تھی جن میں نشہ ملا ہوتا تھا۔ آغا عمران نے ذیشان کے ذریعے ایسی جگہوں سے کھانے پینے کے اشیاء کے نمونے حاصل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ..... جواد نے اپنا کردار بخوبی نبھایا تھا اور انصاری صاحب اس سے مطمئن تھے۔ مس نائلہ جو اس ڈرامے میں، اداکاری سکھانے والی ایک ٹیچر کا رول کر رہی تھیں، جواد سے خاصی متاثر تھیں۔ ریہرسل ختم کرنے کے بعد ایک بچے نے جواد کے منع کرنے کے باوجود ایک ٹافی کھائی اور بے ہوش ہوگیا۔ اسے ٹی وی اسٹیشن کی وین میں فوراً ہسپتال پہنچایا گیا۔ جواد نے آغا عمران صاحب کو فون کیا اور جلدی سے ہسپتال پہنچنے کے لئے کہا۔

آغا عمران سخت پریشان تھے کیوں کہ وائرلیس پر انسپکٹر شعیب سے کوئی رابطہ نہیں ہو رہا تھا پھر فون پر رابطہ ہوا تھا تو انسپکٹر نے بتایا کہ دشمنوں نے ان پر خود کار اسلحہ سے فائرنگ کر کے ان سے فائل چھین لی ہے۔ آغا صاحب نے انہیں تسلی دی اور خود ہسپتال کی طرف چلے گئے۔ وہ حیران تھے کے بچہ ٹافی کھا کر بے ہوش کیسے ہوگیا۔

جواد کی ان ڈور ریکارڈنگ ختم ہوئی تو مس نائلہ نے اسے اپنی کار میں گھر تک چھوڑنے کی پیش کش کی۔ مس نائلہ سے اپنے ابو سے ملوانے کے لئے اپنے گھر لے جانا چاہتی تھیں مگر جواد نے کل آنے کا وعدہ کر کے اپنے گھر جانے کا فیصلہ کیا۔ راستے میں انہیں سرخ رنگ کی ایک مشکوک کار نظر آئی جو مس نائلہ کے ابو کی تھی۔ گھر پہنچ کر جواد نے ذیشان کو تمام واقعات سے آگاہ کیا اور کہا کہ کل وہ مس نائلہ کے گھر جائے گا اگر رات آٹھ بجے تک اس کا فون نہ آئے تو آغا عمران کو کہہ دیا جائے کہ ان کی جان خطرے میں ہے اور اگلے دن ذیشان نے ٹھیک آٹھ بجے رات اپنے ابو کو یہ پیغام پہنچا دیا۔

اب آپ آگے پڑھیئے

ایک بہت بڑی قلعہ نما کوٹھی کے باہر آغا عمران اور انسپکٹر شعیب کھڑے سوچ رہے تھے کہ آج انہوں نے معرکہ سر کر لیا۔ اس کوٹھی کا مالک یقیناً بہت بڑا اسمگلر ہوگا اور ہو سکتا ہے شہر میں فروخت ہونے والی ہیروئن کی تجارت میں بھی اس کا ہاتھ ہو۔ انسپکٹر شعیب نے وائرلیس پر ان تمام لوگوں سے بات کی جنہوں نے پوری کوٹھی کو گھیر رکھا تھا۔ ہر طرح سے مطمئن ہونے کے بعد انسپکٹر شعیب نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔

"کون ہے؟"

ایک کرخت آواز آئی۔ مگر انسپکٹر شعیب کے ایک بھرپور وار نے چوکیدار کو بہت پیار سے بے ہوش

کر دیا۔ انسپکٹر شعیب نے اسے گھسیٹا اور گیٹ کی دیوار کے ساتھ چھپا کر بٹھا دیا اور پھر ایک لمحہ ضائع کیئے بغیر دونوں گیٹ کے ساتھ ہی درختوں کی آڑ میں دُبک گئے۔ وہ ابھی حالات کا جائزہ لے ہی رہے تھے کہ انہوں نے دیکھا۔ جواد دروازے سے باہر نکلا۔

اس کے پیچھے ایک کلاشن کوف بردار خوفناک سا آدمی تھا۔

کلاشن کوف بردار شخص کے پیچھے ایک اسمارٹ آدمی تھا اور اسمارٹ آدمی کے ساتھ ایک لڑکی تھی۔

"غالباً یہی نائلہ ہے؟" انسپکٹر شعیب نے آغا عمران کے کان میں سرگوشی کی۔

"اور غالباً وہ نائلہ کا باپ ہے۔" آغا عمران نے مذاق کے انداز میں کہا۔

انسپکٹر شعیب کو اپنی حماقت کا احساس ہوا کہ اس نے یہ کیا بات کہی تھی کہ غالباً یہ نائلہ ہے۔

جواد کو ایک بہت بڑی گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ اس گاڑی کے پیچھے وہ کلاشن کوف بردار شخص بیٹھ گیا۔ نائلہ کے ابو نے ایک طرف دیکھتے ہوئے چٹکی بجائی۔ ایک اور گاڑی آگے بڑھی اور نائلہ کے ابّو اس گاڑی میں بیٹھ گئے دونوں گاڑیاں گیٹ کی طرف بڑھیں، گیٹ ریموٹ کے ذریعہ خود بخود کھل گیا۔

"چوکیدار! چوکیدار؟"

کسی طرف سے آوازیں آئیں۔ انسپکٹر شعیب نے آغا عمران کی طرف دیکھا اور دونوں تیزی سے درختوں کی آڑ سے باہر نکل آئے۔ انسپکٹر شعیب نے وائرلیس پر تمام پولیس دستوں کو فارغ کر دیا اور آغا عمران کے ساتھ گاڑی پر سوار ہو کر صرف ایک جیپ کو اپنے پیچھے آنے کی ہدایت کی۔ مقصد یہ تھا کہ آگے جانے والی دونوں گاڑیوں کا تعاقب کیا جائے تھوڑی دیر بعد دونوں گاڑیاں ایک سگنل پر رکیں، بتی سبز ہوتے ہی ایک گاڑی دائیں اور دوسری بائیں طرف کو مڑ گئی۔ انسپکٹر شعیب کو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ پیچھے سے ہارن پہ ہارن بج رہے تھے۔ آخر وہ بھی ٹریفک کے ساتھ دائیں طرف کو مڑ گیا، جدھر نائلہ کے ابو کی گاڑی گئی تھی۔ اپنے پیچھے والی پولیس جیپ کو اس نے وائرلیس پر جواد کے پیچھے جانے کے لئے کہا۔

دو ایک سڑکوں پر گھومنے کے بعد نائلہ کے ابو کی کار ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے سامنے رک گئی۔ پتا چلا کہ ہوٹل میں بچوں کی فلاح و بہبود کے لئے کوئی شو ہو رہا ہے جسے نائلہ کی امی نے ترتیب دیا ہے اور نائلہ کے ابو مہمان خصوصی ہیں۔ اس شو کی آمدنی کسی یتیم خانے کو دی جانی تھی۔

انسپکٹر شعیب نے وائرلیس پر رابطہ کیا تو دوسری طرف سے جواب ملا۔ "جواد بخریت اپنے گھر پہنچ گیا ہے اور جواد کو چھوڑ کر وہ گاڑی واپس اپنی کوٹھی چلی گئی ہے۔ چوکیدار کو ہوش آگیا ہے، لیکن اسے

کچھ معلوم نہیں ہے کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔" آغا عمران بہت زور سے ہنسے۔

"لڑکے..... چلو گھر چلیں۔ آج کی تاریخ میں اتنا ہی کافی ہے۔"

"نہیں سر! میں جواد سے ملے بغیر گھر نہیں جاؤں گا۔ آج ہمارے ساتھ کچھ اچھا نہیں ہوا۔"

"کیا اچھا نہیں ہوا؟" آغا عمران نے پوچھا۔ "جواد خیریت سے گھر پہنچ گیا غالباً ذیشان اور جواد کو غلط فہمی ہوئی ہے' نائلہ کا خاندان ..... اچھے لوگ ہیں۔ یہ ناجائز اسلحہ وغیرہ تو معمولی بات ہے اور ممکن ہے ان کے پاس اس کا لائسنس بھی ہو۔"

"نہیں سر، ..... یہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔"

"ٹھیک ہے تم نائلہ کے باپ کی فائل کھول لو۔ آخر کب تک ہم اسے نائلہ کا باپ کہتے رہیں۔ آخر اس کا کوئی نام بھی تو ہوگا۔"

.....○.....○.....

"نائلہ کے ابو کا نام سخی بٹ ہے۔"

جواد نے انسپکٹر شعیب کے پہلے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "مجھ میں ان کی دلچسپی نائلہ کی وجہ سے ہے۔ نائلہ ان کی اکلوتی بیٹی ہے اور وہ اس سے بے حد پیار کرتے ہیں، کسی بات سے انکار نہیں کرتے۔ نائلہ نے کہا، میں ٹی وی ڈراموں میں کام کرنا چاہتی ہوں۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے کیجئے۔ نائلہ نے کہا میں آپ سے ایک عجیب و غریب قوت کے مالک لڑکے سے ملوانا چاہتی ہوں۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے مل لوں گا، حالانکہ انہیں اس دن ایک اہم فنکشن میں جانا تھا لیکن اپنی بیٹی کی وجہ سے کافی دیر مجھ سے باتیں کرتے رہے۔"

"کیا باتیں؟" انسپکٹر شعیب نے پوچھا۔

"یہی کہ میں کیا کرتا ہوں؟ یہ اتفاقات کیسے ہو جاتے ہیں؟ میرے والدین کیا کرتے ہیں؟"

"یہ سخی بٹ صاحب کام کیا کرتے ہیں؟" انسپکٹر شعیب نے پوچھا۔

"وہ پراپرٹی کا کام کرتے ہیں۔ انہوں نے مجھے اپنی کہانی سنائی تھی۔ وہ آج سے کوئی دس سال پہلے گاؤں سے آئے تھے۔ نہایت غریب آدمی تھے۔ اپنی محنت اور دیانت سے وہ اتنے امیر ہوگئے آج ان کی ایک گارمنٹس فیکٹری ہے اور چند پلازوں کے بھی مالک ہیں۔"

انسپکٹر شعیب سوچ رہا تھا..... آدمی محنت اور دیانت سے کروڑ پتی کیسے بن سکتا ہے..... ضرور اندر کوئی گھپلا ہے۔

جواد نے اپنے لئے کچھ کتابیں خریدنا تھیں۔ اس نے اپنی امی سے اجازت لی اور سائیکل لے کر بازار نکل گیا۔ وہ کتابیں خرید کر واپس آرہا تھا کہ اس کے سائیکل کی چین کچھ گڑبڑ کرنے لگی ٹھیک طرح سے گیئر نہیں لگ رہا تھا۔ وہ سائیکل کو سڑک کے کنارے کھڑا کر کے چین دیکھنے لگا اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ اس نے سوچا، چلو کسی کاریگر کو دکھالیتا ہوں ابھی وہ سوچ رہا تھا کہ قریب ترین مستری کہاں ملے گا کہ اتنے میں ایک کار اس کے پاس آکر کھڑی ہوگئی اس کے اندر بیٹھے ہوئے لوگ آپس میں باتیں کرنے لگے۔

"پوچھ لیتے ہیں۔"

"بچے سے رستہ پوچھو گے؟"

"تو کیا ہوا؟"

اتنے میں ایک شخص نے جواد کو آواز دی۔

"بیٹے!"

"جی؟"

"ہم شہر سے باہر جانا چاہتے ہیں۔ دراصل ہم آپ کے شہر میں اجنبی ہیں۔" جواد نے انہیں جی ٹی روڈ کا رستہ بتا دیا۔ جب وہ جانے لگے تو جواد نے انہیں رکنے کے لئے کہا۔ "آپ اس طرح کریں کہ آپ اس رستے پر نہ جائیں۔ بلکہ بائیں طرف سے جو سپر مارکیٹ کے ساتھ رستہ نکلتا ہے، وہاں سے آپ بڑی سڑک لے لیں اور اس پر سے ہو کر دوبارہ پل کے نیچے آجائیں۔ پل سے نیچے جانے والی سڑک سیدھی مغرب کی طرف جی ٹی روڈ پر جا نکلے گی، حالانکہ یہ رستہ تھوڑا سا طویل ہے لیکن آپ کے لئے محفوظ ہے۔"

"کیا مطلب؟" ایک شخص نے گھبرا کر پوچھا۔

"مطلب مجھے بھی معلوم نہیں۔ میں نے دونوں رستے آپ کو بتا دیئے ہیں۔" وہ سب لوگ مل کر زور سے ہنسے اور آگے بڑھ گئے۔ اور جواد کسی کاریگر کی تلاش میں نکل گیا۔

دوسرے دن اخبار میں ایک حادثے کی خبر پڑھ کر جواد نہایت پریشان ہوا۔ یہ وہی کار تھی جس کے سواروں کو جواد نے رستہ بتایا تھا۔ تفصیل پڑھنے سے معلوم ہوا کہ جرائم پیشہ لوگ تھے۔ گاڑی حادثے کا شکار ہوگئی۔ لوگ بھی زخمی ہوئے لیکن وہ لوگ کار چھوڑ کر بھاگ گئے۔

جواد نے فوری طور پر ذیشان کو فون کیا۔

"ذیشان تمہیں پتا ہے؟"

"نہیں مجھے کچھ نہیں پتا۔" ذیشان نے شرارتی موڈ میں جواب دیا۔

"بھئی سنو تو۔ بات یہ ہے کہ آج اخبار میں دوسرے صفحے پر جو حادثے کی خبر ہے۔ یہ لوگ مجھے ملے تھے۔"

"تو یہ تم نے انہیں مروایا ہے۔"

"نہیں میں نے تو انہیں محفوظ راستہ بتایا تھا لیکن وہ جان بوجھ کر اس راستے پر گئے اور....."

"تو آج کل آپ مجرموں کی راہنمائی بھی کر رہے ہیں؟"

"مجھے کیا پتا تھا کہ وہ کون ہیں۔"

"اچھا تم اس طرح کرو۔" ذیشان نے کہا۔ "تم میری طرف آجاؤ۔ آج اجلال بھی ہوسٹل سے آیا ہوا ہے۔"

"اچھا اچھا..... وہی ڈاکو کا بیٹا۔"

"جواد.....!" ذیشان نے بُرا مانتے ہوئے کہا۔

"اجلال ڈاکو کا بیٹا نہیں ہے۔ وہ ایک بہادر عورت کا بیٹا ہے، اور تمہیں یہ بھی پتا ہے کہ اس کی ماں نے اپنے بیٹے کے مستقبل کے لئے اپنے ڈاکو شوہر کی مخبری کی تھی، جو بعد میں پولیس مقابلے میں مارا گیا اور تمہیں یہ بھی پتا ہے کہ اجلال کی ماں ایک ملک دشمن اور ڈاکوؤں کے سرپرست کو قتل کرنے کے جرم میں جیل کاٹ رہی ہے۔ اور تمہیں یہ بھی پتا ہے کہ میرے ابّو نے اجلال کو اپنا بیٹا بنایا ہوا ہے۔"

"بھئی میں معافی چاہتا ہوں۔ مجھے سب پتا ہے اور خاص طور پر میں آپریشن جنگل جنگل کو کیسے بھول سکتا ہوں اس اجلال کی وجہ سے میرے پیارے دوست ذیشان کی جان بچی تھی۔"

"بہرحال اگر تمہیں سب پتا ہے تو میں آئندہ تمہاری زبان سے 'اجلال ڈاکو کا بیٹا' نہ سنوں۔ تمہاری طرح وہ میرا دوست ہے اور میرا بھائی ہے۔"

"ٹھیک ہے جناب آپ ناراض کیوں ہوتے ہیں۔ آپ کا دوست ہمارا دوست، آپ کا بھائی ہمارا بھائی۔"

"تو پھر آجاؤ اور سب مل کر سوچتے ہیں کہ ہم اس کیس میں پولیس کی مدد کیسے کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اب ہم دو نہیں تین ہیں۔"

"اگر تم کہو تو میں اپنی بہن کو بھی ساتھ لے آؤں۔" جواد نے کہا۔ "اس طرح ہم چار ہو جائیں گے۔"

"نہیں بھئی وہ تو ابھی بہت چھوٹی ہے خواہ مخواہ رونے لگے گی کہ مجھے گھر چھوڑ کر آؤ۔ بس تم آجاؤ۔"

.....○.....

"لڑکے! یہ تمہاری اپنی رپورٹ ہے جس سے سخی بٹ کے خلاف کوئی چیز ثابت نہیں ہوتی۔" آغا عمران، انسپکٹر شعیب کو سمجھا رہے تھے۔

"اس کی سرخ کار چوری ہوئی۔ تھانے میں رپورٹ درج ہے۔"

"اس کے باڈی گارڈز کے پاس ناجائز اسلحہ....."

"ان کے پاس اس اسلحے کا لائسنس ہے۔ اس کی بیوی، اس کی بیٹی اور اس کے اپنے خلاف آج تک کوئی کیس کسی تھانے میں موجود نہیں۔ وہ اور اس کے ملازمین کسی غلط کاروبار میں ملوث نہیں۔ کم از کم تمہارے پاس اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں اس کا صرف امیر ہونا اس کا جرم ثابت نہیں کرتا۔ وہ انکم ٹیکس بھی دیتا ہے۔ میرا خیال ہے لڑکے! تم پٹڑی سے اتر رہے ہو۔ صحیح ٹریک پر چلو۔ میری رائے میں ہم مجرموں تک اس کار حادثے کے ذریعے پہنچ سکتے ہیں جس کے مالک زخمی ہونے کے باوجود بھاگ گئے۔"

"جی ان کے بارے میں یہ رپورٹ ہے۔" انسپکٹر شعیب نے ایک اور فائل آغا عمران کے سامنے پیش کی۔

"ہوں۔ تو کار کراچی سے چوری کی گئی۔ نمبر غلط لگا ہوا تھا۔ کار نمبروں کی کئی پلیٹیں کار میں موجود تھیں۔ یہ پتا نہیں چل رہا کہ یہ لوگ کس گھناؤنے کاروبار میں ملوث ہیں۔ ہو سکتا ہے یہی لوگ باہر سے شہر کو مال سپلائی کرتے ہوں۔ باہر سے آتے ہوں۔ باہر سے نکل جاتے ہوں۔ شہر میں انہوں نے کوئی ٹھکانہ نہ بنایا ہو۔ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہر شہر میں سپلائی باہر سے ہوتی ہو۔"

"جی ہاں سر یہ ہو سکتا ہے کہ سخی بٹ کا گروہ کسی دوسرے شہر میں کام کر رہا ہو۔"

"انسپکٹر شعیب"۔ آغا عمران نے کہا "اگر تم یہ نہ سمجھو کہ میں سخی بٹ کے ساتھ ملا ہوا ہوں تو کچھ عرض کروں۔"

"سر! سر آپ حکم کریں۔"

"میری درخواست پر صرف ایک ہفتے کے لئے سخی بٹ کو بھول جاؤ۔ اور صرف اس کار پر توجہ دو، اور جتنی بھی معلومات تمہارے پاس ہوں، فوری مجھے پہنچاؤ۔ مجھے امید ہے کہ تم مجرموں تک پہنچ جاؤ گے۔"

"اوکے سر۔ پھر آپ اس رپورٹ کا آخری صفحہ پڑھ لیں۔ ویسے تو یہ میرے ایک بے وقوف سے سب انسپکٹر شیدا پستول کی اطلاع ہے لیکن دلچسپ ہے۔

مسمی شیدا پستول سب انسپکٹر سپیشل برانچ ایک ہفتے سے اس کار کے پیچھے ہے۔ یہ کار کئی نمبر بدلتی ہے کئی رنگ بدلتی ہے۔ کبھی جیپ بن جاتی ہے۔ اس کے سوار بھی بدل جاتے ہیں۔ لیکن یہ سب کاریں جیپیں ایک ہی کام کرتی ہیں۔ وہ یہ کہ یہ لوگ اشتیاق علی احسن، جو کراچی میں رہتا ہے اس کے گھر کے ارد گرد کھڑے رہتے ہیں اور جب بھی ان کا بیٹا جواد گھر سے نکلتا ہے وہ اس کا تعاقب کرتے ہیں اور کسی مناسب جگہ پر اسے روک کر رستہ پوچھتے ہیں۔ اور پھر چلے جاتے ہیں۔ غالباً یہ لوگ پاگل ہیں یا نفسیاتی مریض ہیں جنہیں رستہ پوچھنے کی بیماری ہے۔

اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، دوسری طرف ذیشان تھا

"ابّو! جواد اور اس کی بہن دونوں غائب ہیں، دونوں مارکیٹ میں کچھ خریدنے گئے تھے۔"

"تو کیا ہوا بیٹے۔ آجائیں گے بچے ہیں کہیں کھیلنے لگے ہوں گے۔"

"ابو۔ ان کی سائیکل ایک سڑک سے ملی ہے جواد کے ابو اور امی سخت پریشان ہیں۔ آپ کچھ کریں، پلیز!!

(باقی آئندہ)

جوابات ۱ دھوپ ۲...... بس ۳...... سڑک ۴...... گھڑی ۵...... اونٹ ۶...... بجلی کا پنکھا۔

MASS

اسٹیمر بنائیے

منیر احمد راشد

کراچی میں رہنے والے اکثر اور باہر سے آنے والے بچے خاص طور پر منوڑا کی سیر کو جاتے ہیں۔ منوڑا تک پہنچنے کے لئے کیماڑی کی بندر گاہ سے اسٹیمر میں سوار ہونا پڑتا ہے۔ اس طرح ان لوگوں کے لئے جو پہلی مرتبہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں سیر کا مزہ دوبالا ہو جاتا ہے۔ یہاں ایک سوال یہ بھی ان کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ آخر بغیر چپوؤں کے یا کسی اور شے سے دھکیلے بغیر اتنی بڑی کشتی کس طرح پانی پر آگے بڑھتی ہے۔ کسی بڑے سے یہ سوال کیا جائے تو جواب ملتا ہے کہ بھاپ کے انجن کی وجہ سے کشتی آگے بڑھتی ہے۔ مگر اس جواب کے بعد بھی ایک سوال باقی رہ جاتا ہے..... کیسے؟ آئیے ہم آپ کو دُخانی کشتی بنانا سکھاتے ہیں۔ اس سے آپ کو یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ بھاپ کی مدد سے کشتی کس طرح آگے بڑھتی ہے۔ ایک دُخانی کشتی بنانے کے لئے آپ کو مندرجہ ذیل چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

(۱) ایک ہلکی لیکن گہری اور بڑی ٹرے۔ (پیٹرول یا موبل آئل کے ڈبے کو بھی کاٹ کر استعمال کیا جا سکتا ہے)

(۲) قدرے سخت تار۔

(۳) موم بتی۔

(۴) ٹن کا ایک گول ڈبا جس کا ڈھکن چوڑیوں والا ہو۔ (عام طور پر پاؤڈر کے ڈبے ایسے ہوتے ہیں)

(۵) ایک کیل اور ہتوڑی۔

(۶) پانی۔

(۷) مددگار (بڑا بھائی یا بہن)

(۱) بڑے بھائی یا بہن سے کہہ کر ٹن کے ڈبے کے پیندے میں کیل کی مدد سے ایک سوراخ بنوائیے۔ اسے اچھی طرح چیک کر لیجئے کہ سوراخ آر پار ہو گیا ہے یا نہیں۔

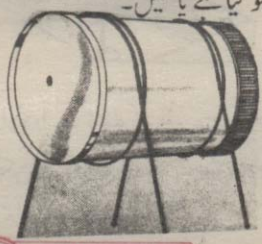

(۲) تار کو ڈبے کے دونوں سروں پر لپیٹ کر ایک اسٹینڈ سا بنائیے۔ دھیان رہے کہ تار کے چار پایوں پر کھڑا ہوا ڈبا بالکل متوازن ہو۔ یعنی آگے یا پیچھے کسی طرف جھکا ہوا نہ ہو۔

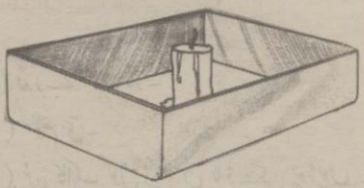

(۳) ٹرے یا کٹے ہوئے ڈبے کے درمیان موم بتی کو اچھی طرح جما دیجئے۔ اس کے بعد ٹن کے سوراخ والے ڈبے کو اسٹینڈ سمیت اس ٹرے میں اس طرح رکھ کر دیکھئے کہ اس کے چاروں پاؤں ٹرے کے چاروں کونوں میں آجائیں اور موم بتی بالکل اس کے نیچے اور درمیان میں۔ اس بات کا یقین کر لیجئے کہ اسٹینڈ پر موجود ڈبہ متوازن ہے اور اتنا بلند بھی کہ اس کے نیچے جلتی ہوئی موم بتی کے شعلے کے لئے مناسب جگہ ہے۔

(۴) سوراخ والے ڈبے کو پانی سے آدھا بھر لیجئے۔ ڈھکن کو اچھی طرح بند کر کے، اسٹینڈ کو دوبارہ اسی انداز میں ٹرے میں رکھئے۔

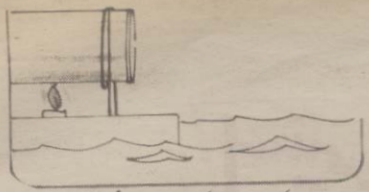

(۵) ٹرے کو نہانے کے ٹب یا پانی کے حوض میں رکھئے۔ موم بتی کو جلا دیجئے۔ ٹن کے گرم ہوتے ہوئے ڈبے کو مت چھوئیے۔ تھوڑی دیر بعد ڈبے کے اندر موجود پانی گرم ہو کر کھولنا شروع کر دے گا۔ اس طرح بھاپ بنے گی اور اچانک آپ دیکھیں گے کہ کشتی آگے کی جانب دوڑ پڑی ہے۔ یہ سب کیوں ہوا..... اس لئے کہ جیسے ہی بھاپ ایک دباؤ کے ساتھ سوراخ سے نکلی تو اس نے ڈبے کو مخالف سمت میں دھکیل دیا۔ بھاپ کے سوراخ سے نکلنے کو عمل اور اس کے نتیجے کے طور پر کشتی کے مخالف سمت میں حرکت کرنے کو ردِ عمل کہا جاتا ہے۔ اسی عمل اور ردِ عمل کی وجہ سے کشتی حرکت کرتی ہے۔ اور یہ عمل جتنی قوت سے ہو گا ردِ عمل بھی اتنی ہی قوت سے ہو گا۔ مگر اس کی سمت مخالف ہو گی۔ نیوٹن کا حرکت کا قانون ہے کہ عمل اور ردِ عمل برابر ہوتا ہے لیکن سمت میں مخالف ہوتا ہے۔

کشتی بنانے کا آسان سا طریقہ تو ہم نے آپ کو بتا دیا۔ اب اس کے استعمال کا بھی ایک آئیڈیا آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اکثر گھروں میں بچے گڑیا اور گڈے کی شادی کرتے رہتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ان کو کشتی کی سیر بھی کرائی جائے۔ اس طرح آپ اپنے ہی گھر میں ایک چھوٹا سا کلفٹن بنا سکتے ہیں۔

آنکھ مچولی کے

مقابلۂ تصویرِ آزادی

پاکستان یونہی نہیں بن گیا

آزادی کی خاطر برِصغیر کے مسلمانوں نے اَن گنت قربانیاں دیں، لاکھوں مسلمانوں نے اپنی جان کے نذرانے پیش کیے، ہزاروں لاکھوں لوگوں کی املاک لُٹ گئیں، ننھے بچے کرپانوں پر ٹانگ دیئے گئے، آگ اور خُون کی ہولی کھیلی گئی، تب کہیں جا کر

پیارا پاکستان حاصل ہُوا

آپ تحریکِ پاکستان کو اپنے تصوّر میں جیسا بھی پاتے ہیں ویسا ہی تصویر کر دیجئے ایک رنگین خوبصورت تصویر جس کے رنگ مدھم نہ ہوں

سائز آنکھ مچولی سے دوگنا ہو

جولائی ۹۲ء کی یکم تک ضرور بھجوا دیجئے

خوبصورت تصاویر

آنکھ مچولی کی زینت بھی بنیں گی اور انعام بھی پائیں گی؛

مقابلۂ تصویرِ آزادی

آنکھ مچولی

۱- پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

کامیابی مبارک

اپنی کامیابی سے

ہمیں بھی باخبر کیجئے

آپ کسی بھی کلاس کے طالب علم ہوں ... اگر آپ نے کلاس میں

پہلی پوزیشن

دوسری پوزیشن

یا

تیسری پوزیشن

حاصل کی ہے تو اس کی تصدیق اپنے تعلیمی ادارے کے سربراہ سے کروائیے اور ہمیں بھجوا دیجئے؛

ہم آپ کو

پرائڈ آف پوزیشن

کی سَنَد دیں گے

تحریکِ فروغِ علم میں پیش پیش

ماہنامہ

آنکھ مچولی

۱- پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

اگر آپ کو
وزیراعظم
بنا دیا جائے

پیارے ساتھیو!

- آپ کو جنت نشاں کشمیر سے محبت ہے؛
- آپ کشمیر کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں؛
- اور آپ کشمیر کے لیے کچھ کرنا بھی چاہتے ہیں؛

اگر آپ کو پاکستان کا وزیراعظم بنا دیا جائے تو آپ کشمیر کی آزادی کے لیے کیا کریں گے؟

اپنا جواب دو سے تین سطروں میں لکھ کر ۱۰ جون ۱۹۹۲ء تک ہمیں بھیج دیجیے۔ تین بہترین جوابات دینے والوں کو ایک سال کے لیے آنکھ مچولی بطور انعام جاری کیا جائے گا۔

ادارہ آنکھ مچولی "کشمیر سیل"
1- پی آئی بی کالونی کراچی

آنکھ مچولی
کشمیر نمبر

جولائی ۹۲ء میں شائع ہو رہا ہے

- خونِ دل میں ڈوبی ہوئی دل گداز تحریریں۔
- آنکھوں کو اشکبار کر دینے والی تصویریں۔
- جدّوجہدِ آزادی کے لمحے لمحے کی روداد۔
- شجاعت و بہادری کے چونکا دینے والے قصے۔

آنکھ مچولی

جہاد بالقلم کے سفر پہ
آپ بھی قلم اٹھائیے

کشمیر پر کچھ رقم کیجیے
اور اپنی تحریروں کو تاریخی دستاویز بنا دیجیے

آئندہ ماہ
آنکھ مچولی کا کشمیر نمبر ضرور حاصل کیجیے

قیمت وہی -/۱۰ روپے

درِ حیرت

سائنسی موضوعات پر سوال و جواب کا سلسلہ

س...... ہم نے سنا ہے کہ اونٹ کے کوہان میں پانی ذخیرہ کرنے کی جگہ ہوتی ہے جس سے وہ اپنی پیاس بجھاتا ہے۔ کیا یہ درست ہے ؟ (سارہ علی کوئٹہ)

ج ...... جی نہیں ! اب یہ خیال پرانا ہو چلا۔ حقیقت یہ ہے کہ اونٹ کا کوہان چربی کے ذخیرے پر مشتمل ہوتا ہے جو ایک کیمیاوی عمل کے ذریعے سے اونٹ کی پانی کی ضروریات کو پورا کرتا ہے اور اسی کی بدولت اونٹ صحرائی علاقوں میں ۱۷، ۱۸ دنوں تک پانی پیئے بغیر گزارا کر سکتا ہے۔ پانی کی فراہمی پر اونٹ سو لیٹر سے زیادہ پانی پی کر اپنے جسم میں اس کی کمی کو پورا کر سکتا ہے۔ دنیا کے بعض علاقوں میں دو کوہان والے اونٹ بھی پائے جاتے ہیں جن میں موسم کی سختیاں جھیلنے کا مادہ عام اونٹ کی نسبت زیادہ ہوتا ہے۔ اونٹ کی اسی خصوصیت کی نسبت سے اسے صحرائی جہاز بھی کہا جاتا ہے۔

صحرائے عرب کی روایتوں، حکایتوں اور تاریخی واقعات میں اس کا ذکر اتنے تواتر سے ملتا ہے کہ اسے بجاطور پر صحرانشینوں کی تہذیب کا ایک حصہ سمجھنا چاہئے۔

س..... زمین خود گردش میں ہے تو پھر جہاز فضا میں ٹھہر کر مطلوبہ مقام کے قریب آنے کا انتظار کیوں نہیں کرتا؟ (عمر حیات ڈوگر..... گنڈا سنگھ والا قصور)

ج..... آپ کے سوال کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ ہوائی جہاز ہوا میں پرواز کر رہا ہے۔

۲۔ زمین اپنے طور پر گھوم رہی ہے۔

۳۔ کیا جہاز کی منزل کا تعین زمین کی گردش سے ہو گا؟

یقین کیجئے اگر ایسا ہوتا تو بڑی مزیدار صورت حال ہوتی۔ ہم ہیلی کاپٹر یا کسی ایسی ہوائی مشین میں سوار ہوتے جو بجائے کسی سمت جانے کے اپنی جگہ معلق ہوتی۔ زمین اس اثنا میں اپنے طور پر گھوم جاتی اور جب ہم دوبارہ زمین پر آتے تو زمین کی حرکت کی وجہ سے کسی اور مقام پر اتر جاتے۔ لیکن ایسا تو اس وقت ممکن تھا کہ جب زمین پر کسی قسم کی فضا کا کوئی وجود نہ ہوتا۔ زمین کے ارد گرد فضائی غلاف کے بارے میں تو آپ جانتے ہی ہیں جو مختلف گیسوں کا آمیزہ ہے۔ یہ غلاف زمینی گردش کے باعث زمین کے ساتھ ساتھ ہی گھوم رہا ہے۔ لہٰذا، کسی ایسی صورت حال کے پیدا ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا جس کی آپ نے اپنے سوال میں نشاندہی کی ہے۔ فضائی غلاف میں موجود کوئی بھی معلق جسم زمین کے حوالے سے ساکت ہی تصور کیا جائے گا۔ اور اس کی صورت ایسی ہی ہوگی جیسی کہ زمین پر موجود کسی جسم کی۔ یعنی زمین اپنے فضائی غلاف سمیت اپنے طور پر گردش کر رہی ہے۔ لہٰذا ہم زمین کے رہنے والے بھی مستقل حرکت میں ہیں۔ اور فضا میں اگر کوئی جسم معلق ہے تو وہ بھی اس گردش کا حصہ ہے۔

س..... انسانی جسم میں مساموں کا کھلنے اور بند ہونے کا عمل کس طرح جاری رہتا ہے؟ (ذیشان اظہر..... رحیم یار خان)

ج ..... ایک عام انسانی جسم میں تقریباً بیس لاکھ پسینے کے غدود ہوتے ہیں اور یہ جسم پر ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ دوسری جگہوں کے مقابلے میں پیروں کے تلوں اور ہتھیلیوں میں یہ غدود زیادہ گنجان آباد ہوتے ہیں۔ ان غدود کا کام پسینے کی تیاری ہوتا ہے جو کہ ہماری جلد پر موجود چھوٹے چھوٹے بے شمار مسامات کے ذریعے خارج ہوتا ہے۔ لوگ عام طور پر پسینہ آنے سے گھبراتے ہیں لیکن یہ عمل ہماری صحت کے لئے بہت ضروری ہے۔ اس سے جسم کا درجۂ حرارت معتدل رہتا ہے۔ محنت مشقت والے کام اور کھیل کود سے جسم میں گرمی پیدا ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ پسینے کا اخراج درجۂ حرارت کو بڑھنے سے روکتا ہے جو کہ معمول سے بڑھنے نہیں پاتا۔ بعض بیماریوں کے نتیجے میں جسم کے کچھ مسامات بند ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں مرض کا علاج کرانا ضروری ہے۔

س ..... ہوائی جہاز میں سفر کرتے ہوئے فاؤنٹین پین سے سیاہی نکال دینے کی ہدایت کیوں کی جاتی ہے ؟ (غلام مجتبیٰ جوکھیو ..... لاڑکانہ)

ج ..... آج کل کے جدید ہوائی جہاز تو اس طریقے پر بنائے جاتے ہیں کہ ان کے اندر ہوا کا یکساں دباؤ قائم رہتا ہے۔ پہلے جہازوں میں یہ ہم جیسے جیسے بلندی کی طرف جاتے ہیں، ہوا کا دباؤ اسی لحاظ سے کم ہوتا جاتا ہے۔ اس کم دباؤ کا نتیجہ ہے فاؤنٹین قلم کی سیاہی باہر نکل جاتی ہے جس سے کپڑے وغیرہ خراب ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ لہٰذا دورانِ سفر جہاز میں کسی وجہ سے ہوا کا دباؤ کم ہو جائے تو قلم سے سیاہی نکلنے کا خطرہ رہتا ہے۔ کم دباؤ کی وجہ سے سیاہی نکلنے کا تعلق یہ ہے کہ ہوا کا دباؤ کم ہونے سے جزوی طور پر خلا یا ویکیوم پیدا ہو جاتا ہے۔ خلا کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی اردگرد کی اشیا کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتا ہے۔ ویکیوم کلینر، سکشن پمپ اور بہت ساری دوسری مشینیں اس اصول پر کام کرتی ہیں۔ نلکی کے ذریعے مشروب بھی اسی اصول کے تحت پیا جاتا ہے۔ جب ہم نلکی میں موجود ہوا کو منہ سے کھینچتے ہیں تو نلکی میں جزوی خلا پیدا ہو جاتا ہے اور اسی خلا کو پر کرنے کے لئے مشروب اوپر چڑھ آتا ہے۔

س ..... کیا وجہ ہے کہ فریزر میں رکھا ہوا کھانا خراب نہیں ہوتا؟ (اختر علی جاوید ..... صادق آباد)

ج ..... آپ نے بارہا بیکٹریا کا تذکرہ سنا ہوگا۔ یہ وہ ننھے منے جرثومے ہیں جو عام آنکھ سے نظر نہیں آتے اور انہیں دیکھنے کے لئے طاقتور خوردبینوں کی مدد لینی پڑتی ہے۔ یہ بیکٹریا کھانے پینے کی چیزوں کے گلنے اور سڑنے کے عمل کے ذمہ دار ہیں۔ لیکن انہیں بھی تمام دیگر جانداروں کی طرح پھلنے اور پھولنے کے لئے پانی کی ضرورت

پڑتی ہے۔

ڈیپ فریزر میں درجۂ حرارت کو منفی ۱۵ ڈگری فارن ہائیٹ تک کم کر دیا جاتا ہے جس کے نتیجے میں خوراک میں موجود نمی منجمد ہو جاتی ہے اور اس طرح بیکٹریا حضرات کو اپنی کارگزاری دکھانے کا موقع نہیں ملتا۔ نتیجتاً، منجمد کی ہوئی خوراک کو طویل مدت تک محفوظ حالت میں رکھا جا سکتا ہے۔

کھانے کی چیزوں کو برفانے کے اس عمل سے پرانے زمانے کے لوگ بھی واقف تھے۔ آپ کی دلچسپی کے لئے یہ بھی بتاتے چلیں کہ کھانے پینے کی چیزوں کو طویل عرصے تک محفوظ کرنے کے اور بھی کئی طریقے مروّج ہیں۔ مثلاً مچھلی اور گوشت کے پارچوں کو سکھا کر کافی عرصے تک قابل استعمال حالت میں رکھا جا سکتا ہے۔

س ...... اُلّو کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ رات کو شکار کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اسے صرف رات کے وقت نظر آتا ہے۔ اور کیا یہ دن کے وقت اندھا ہو جاتا ہے؟ (عمران خان ...... کراچی)

ج ...... ایک انسانی آنکھ کی نسبت اُلّو رات کے وقت سو گنا زیادہ دیکھ سکتا ہے۔ یہ مختلف رنگوں میں تمیز نہیں کر سکتا لیکن آنکھ کی مخصوص بناوٹ کی وجہ سے رات کے وقت اسے اپنے شکار کو دیکھنے میں کوئی دِقّت نہیں ہوتی۔ اُلّو کی سہولت نہیں تھی۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ آنکھیں اس کی جسامت کے لحاظ سے بہت بڑی ہوتی ہیں۔ اسی لئے وہ نہایت کم روشنی کو بھی جذب کر کے اسے واضح طور پر دیکھنے پر قادر کر دیتی ہیں۔ اُلّو نہایت دور تک دیکھ سکتا ہے اور اس کی سننے کی صلاحیت اور دوسرے پرندوں کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے۔ یہ دن کے وقت بھی بخوبی دیکھ سکتے ہیں تاہم ان کی بعض اقسام دن کے مقابلے میں رات کو بہتر دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ اُلّو ایک ماہر شکاری ہے اور چوہے تو اس کی من پسند خوراک ہیں۔

پرندے ہماری کائنات کا حُسن ہیں
پرندے نظامِ حیات کا جزوِ لازم ہیں
اِنھیں نہ ماریئے
انھیں ان کی فطری عمر تک جینے کا حق دیجیے

چنن کا جنگل

سید نظر زیدی

اچھے بچو! یہ کہانی میں نے ایک ہندو عالم کی زبان سے سنی تھی، میں اسے آسان اردو زبان میں تمہارے لئے لکھ رہا ہوں۔ کہانی کچھ یوں ہے۔

بہت پرانے زمانے کی بات ہے ایک راجہ اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ شکار کھیلنے کے لئے گیا۔ وہ شکار کے لئے اکثر جایا کرتا تھا اور بالکل آسانی سے بہت سے چکارے اور چیتل شکار کر لیتا تھا (یہ ہرنوں کی قسمیں ہیں) لیکن اس دن کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ اسے ایک مرغابی بھی نہ ملی۔

راجہ اور اس کے ساتھی جنگل میں مارے مارے پھرتے رہے۔ جب دوپہر سر پر آگئی تو وزیر نے کہا۔ "مہاراجہ ایسا لگتا ہے کہ آج جب ہم راجدھانی سے چلے تھے تو کوئی منحوس گھڑی تھی۔ بہتر یہ ہوگا کہ لوٹ چلیں۔ آج شکار نہ ملے گا۔"

اس زمانے کے ہندو اس بات کو بالکل ٹھیک مانتے تھے کہ کوئی وقت اچھا اور کوئی بُرا ہوتا ہے، چنانچہ اسی لئے وہ پنڈتوں سے پوچھا کرتے تھے کہ یہ کام ہمیں شروع کرنا چاہئے یا نہیں؟ اور وہ ستاروں کا حساب لگا کر بتا دیا کرتے تھے کہ کام شروع کیا جائے یا نہ کیا جائے۔

اصل بات یہ تھی کہ چالاک پنڈتوں نے اپنی قوم کو اس وہم میں پھنسا دیا تھا۔ کسی کام میں کامیابی یا ناکامی تو اس وجہ سے ہوتی ہے کہ اس کے لئے کتنی اور کیسی کوشش کی گئی۔ قابل اور بہادر لوگ جس کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں اسے پورا کر لیتے ہیں، کیونکہ اللہ پاک نے اپنی خاص رحمت سے انسان کو بہت طاقت دی ہے۔ اس کا درجہ فرشتوں اور جنوں سے بھی بڑا ہے۔

یہ راجہ بھی پنڈتوں کی بتائی ہوئی باتوں کو ٹھیک تو جانتا تھا، لیکن اس دن اسے کچھ غصہ آ گیا۔ اپنے وزیر کی بات سن کر بولا، "چاہے کچھ بھی ہے، لیکن ہم خالی ہاتھ نہ لوٹیں گے۔ تم لوگ یہیں ٹھہرو، ہم اکیلے جاتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ بہت جلد کوئی موٹا تازہ ہرن شکار کر لیں گے۔"

یہ کہہ کر راجہ نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور ایک طرف روانہ ہو گیا، لیکن نتیجہ وہی نکلا، وہ کئی گھنٹے گھنے جنگل میں مارا مارا پھرتا رہا اور خالی ہاتھ رہا۔ دھوپ بہت تیز تھی۔ راجہ کے ساتھ اس کا گھوڑا بھی نڈھال ہو گیا۔ پیاس سے ہونٹ خشک ہو گئے۔ پسینے سے سارا بدن بھیگ گیا اور سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا۔ مجبور ہو کر راجہ ایک جگہ رک گیا اور چاروں طرف دیکھنے لگا کہ پانی کا کوئی چشمہ یا جوہڑ نظر آ جائے تو پیاس بجھائے، لیکن ناکام رہا، اسے اب یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اس وقت کونسے علاقے میں ہے اور اپنے لشکر سے کتنی دور آ گیا ہے۔

آدمی چاہے راجہ ہی ہو، لیکن مصیبت میں پریشان تو ہوتا ہی ہے۔ اس راجہ کا بھی یہی حال ہوا۔ وہ سوچنے لگا میں نے غلطی کی ہے۔ معلوم نہیں اب زندہ سلامت اپنے ساتھیوں تک پہنچوں گا یا نہیں! لیکن خدا کی شان دیکھئے، مایوسی کی اس حالت میں ایک لکڑہارا اپنے سر پر لکڑیوں کا گٹھا اٹھائے اس کے پاس سے گزرا۔ راجہ نے آدمی کی صورت دیکھی تو اس سے کہا۔ "بھائی ذرا رکنا، پیاس کی وجہ سے ہماری جان نکلی جا رہی ہے۔ تم اس علاقے کے رہنے والے ہو، مہربانی کر کے بتاؤ پانی کہاں ملے گا؟"

راجہ کی بات سن کر لکڑہارا رک گیا۔ راجہ کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولا، "سوار، تم پردیسی لگتے ہو۔ ایسا نہ ہوتا تو یہاں کی تکلیف نہ اٹھاتے۔ سامنے والے ٹیلے کے پرلی طرف تو ٹھنڈے میٹھے پانی کا چشمہ بہہ رہا ہے۔ آؤ میرے ساتھ، میں اس چشمے کے پاس ہی اپنی کٹیا میں رہتا ہوں۔ تم بھوکے بھی لگتے ہو۔ روکھی سوکھی کھانے کو بھی مل جائے گی اور تمہارے گھوڑے کے لئے گھاس دانے کا انتظام بھی ہو جائے گا۔"

راجہ کو تو یوں لگا کہ اسے نئے سرے سے زندگی ملی ہے۔ وہ لکڑہارے کے ساتھ اس کی کٹیا میں آگیا اور لکڑہارے اور اس کی بیوی نے اسے بہت آرام پہنچا۔

مکئی کی روٹی کھا کر اور ٹھنڈا پانی پی کر راجہ کے ہوش حواس ٹھیک ہوئے تو یہ بات بھی اس کی سمجھ میں آگئی کہ اس وقت وہ اپنے ملک کے کسی حصے میں ہے۔ اس نے سچے دل سے لکڑہارے اور اس کی بیوی کا شکریہ ادا کیا اور چلتے وقت اس سے کہا۔ "میاں لکڑہارے یوں لگتا ہے کہ آج بھگوان (خدا) ہم دونوں ہی پر مہربان ہے۔ مجھ پر اس لئے کہ مجھے نئی زندگی مل گئی۔ اگر تم میری مدد نہ کرتے تو نہ میں زندہ بچتا نہ میرا گھوڑا۔ اور تم پر اس لئے کہ تم نے آج کسی عام آدمی کی مدد نہیں کی، بلکہ اپنے ملک کے راجہ کی مدد کی ہے اور تمہاری اس نیکی سے خوش ہو کر ہم تمہیں اس پورے جنگل کا مالک بنا رہے ہیں جہاں تمہاری جھونپڑی ہے۔ ہمیں امید ہے تمہاری باقی زندگی خوب عیش آرام سے گزرے گی۔"

بات ختم کر کے راجہ نے گھوڑے کی باگ اٹھائی اور اس طرف روانہ ہو گیا جہاں اس کا لشکر رکا ہوا تھا۔ اب اسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اس کا لشکر کہاں ہے۔

.....○○.....

اس واقعے کو بیتے دس بارہ سال بیت گئے۔ ایک دن راجہ اپنے دربار میں خزانے کے وزیر سے باتیں کر رہا تھا کہ اچانک اسے لکڑہارے کا خیال آگیا۔ اس نے اپنے اس وزیر کی طرف دیکھا جو اس دن شکار میں اس کے ساتھ تھا اور خوشی بھری آواز میں کہا۔ "منتری! (وزیر) تمہیں یاد ہے، ہم نے نیک دل لکڑہارے کو چندن کے جنگل کا مالک بنا دیا تھا۔ امید ہے اب تو وہ بہت امیر ہو گیا ہو گا۔"

کہانی آگے بڑھانے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا کہ چندن کے بارے میں چند باتیں بتا دوں۔ چندن کو عربی زبان میں صندل کہتے ہیں۔ اس درخت کی لکڑی خوشبودار ہوتی ہے۔ اس میں فائدہ پہنچانے والی تاثیر بھی ہوتی ہے۔ گرمی کے موسم میں صندل کی لکڑی کے برادے سے شربت تیار کیا جاتا ہے جو بہت شوق سے پیا جاتا ہے۔ اسی طرح دواؤں میں بھی یہ لکڑی استعمال کی جاتی ہے، خاص طور سے ہندو تو صندل کو بہت اچھا سمجھتے ہیں۔ اسے گھس کر ماتھے پر لگاتے ہیں، چنانچہ اسی لئے یہ بہت مہنگی بکتی ہے۔

ان چند باتوں کے بعد پھر کہانی شروع۔ راجہ کی بات سن کر خزانے کے وزیر نے کہا۔ "ہاں مہاراج، اب تو وہ لکڑہارا لکھ پتی ہو گیا ہو گا۔ اس نے اپنے لئے بڑا سامان بنوالیا ہو گا اور خوب عیش و آرام کی زندگی گزار رہا ہو گا۔"

"اچھا تو ہم آج ہی اس سے ملنے جائیں گے۔ تم بھی ہمارے ساتھ چلنا۔" راجہ نے کہا۔

.....○○.....

راجہ اور اس کے وزیر کو پکا یقین تھا کہ پھونس کی چھوٹی سے کٹیا کی جگہ لکڑہارا شاندار حویلی میں رہ رہا ہوگا۔ خدمت کے لئے نوکر چاکر ہونگے، لیکن وہاں پہنچے تو اسے اس پہلی حالت میں پایا، بلکہ ان معنوں میں پہلے سے کچھ بُری حالت میں کہ وہ اب بوڑھا اور کمزور ہوگیا تھا اور اس کی طرح اس کی جھونپڑی بھی بوڑھی اور بیمار لگ رہی تھی۔ پھونس پرانا ہونے کی وجہ سے چھپر میں جگہ جگہ سوراخ ہوگئے تھے۔ یہ دیکھ کر راجہ کو بہت افسوس ہوا۔

بوڑھا لکڑہارا ٹوٹی ہوئی جھلنگا چارپائی پر لیٹا تھا۔ راجہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے پاس گیا اور اس سے پوچھا۔

"کہو بابا، کس حال میں ہو؟ ہمیں پہچانا تم نے؟"

لکڑہارے نے چونک کر راجہ کی طرف دیکھا اور اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے تم وہی مسافر ہو جس نے مجھے اس جنگل کا مالک بنا دیا تھا۔ تمہاری دی ہوئی وہ پرچی میں نے بہت حفاظت سے رکھی ہے، مگر کوئی اسے دیکھنے آیا ہی نہیں۔"

"ہاں بابا، ہم وہی ہیں۔ لیکن یہ تو بتاؤ اتنے امیر کبیر ہونے کے بعد بھی تم نے اپنی حالت کیوں نہیں سدھاری؟" راجہ نے کسی قدر ناراض ہو کر کہا۔

"میں اور امیر کبیر!" یہ کہہ کر بوڑھا زور سے ہنسا۔ "بابا مجھ غریب سے کیوں مذاق کرتے ہو۔ بھلا میں امیر کبیر کیسے بن گیا؟" "ایسے کہ ہم نے تمہیں چندن کے اس جنگل کا مالک بنا دیا تھا۔" راجہ نے کہا۔

"اس کا مالک تو میں پہلے بھی تھا۔ سوکھی لکڑیوں کا گٹھا بناتا تھا اور کسی بستی میں جا کر بیچ آتا تھا۔ اب بھی یہی کر رہا ہوں۔ فرق اگر کچھ پڑا ہے تو وہ یہ ہے کہ پہلے ڈر اس کا رہتا تھا کہ راجہ کا کوئی آدمی پکڑ نہ لے۔ اب ذرا بے فکر ہو کر کام کرتا ہوں۔ یہ اطمینان ہوگیا ہے کہ اگر کوئی روکے گا تو تمہاری پرچی اسے دکھادوں گا۔" لکڑہارے نے جماہی لیتے ہوئے کہا اور پھر چارپائی پر لیٹ گیا۔

راجہ غصے بھری آواز میں بولا۔ "بیوقوف، تو نے ہمارے قیمتی انعام کی یہ قدر کی؟"

وزیر پاس کھڑا راجہ اور لکڑہارے کی باتیں سن رہا تھا۔ راجہ کو غصے میں دیکھا تو جلدی سے بولا، "مہاراج، اصل بات یہ ہے کہ اس غریب لکڑہارے کو یہ معلوم ہی نہیں کہ چندن کی لکڑی کتنی قیمتی ہے اور کس بھاؤ بکتی ہے۔ بس اس جہالت کی وجہ سے اس نے اپنا نقصان کیا اور پہلے کی طرح مصیبتوں میں گھرا رہا۔"

راجہ نے وزیر کی بات کو ٹھیک مانتے ہوئے کہا۔ "ہاں ایسا ہی ہے۔ علم کے بغیر آدمی اور جانور

میں بس تھوڑا سا فرق ہی ہوتا ہے۔ جاہل تو ہیرے کو بھی کانچ کا ٹکڑا ہی سمجھتا ہے۔ جیسے اس بد قسمت بوڑھے نے چندن کو معمولی سوکھی لکڑی خیال کیا اور اپنے جیسے جاہلوں کے ہاتھ بیچتا رہا۔" یہ کہہ کر راجہ نے بوڑھے لکڑہارے کی طرف دیکھا اور اس سے کہا۔ "بد قسمت بوڑھے، تو نہیں جانتا تو نے اپنی جہالت کی وجہ سے اپنا کتنا بڑا نقصان کیا ہے۔ اب اگر ہم تجھے بتا بھی دیں کہ یہ لکڑی کتنی قیمتی ہے جسے تو گنواروں کے چولھوں میں جلواتا رہا ہے، تو تجھے اس کا کچھ فائدہ نہ ہوگا، کیونکہ تو بہت بوڑھا ہو گیا ہے اور تیری اولاد بھی نہیں ہے جو اس جنگل سے فائدہ اٹھاتی، اس لئے ہم اپنا بخشا ہوا انعام واپس لیتے ہیں۔"

لکڑہارے کی سمجھ میں اب بھی نہ آیا کہ اس سے کونسا انعام واپس لیا جا رہا ہے۔ اس نے اپنے میلے کرتے کی جیب سے مڑی تڑی پرچی نکال کر راجہ کی طرف بڑھا دی۔ وزیر نے آگے بڑھ کر وہ پرچی لے لی اور بہت ادب سے بولا۔ "مہاراج، اس جاہل اور کم عقل لکڑہارے نے گھر آئی ہوئی دولت کو ٹھکرایا۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی، لیکن مناسب ہوگا اس کی جتنی زندگی باقی ہے مہاراج اس کے لئے کچھ انتظام کر دیں، یہ اور اس کی بیوی آرام سے رہیں گے تو جان مال کو دعائیں دیں گے۔"

راجہ نے اپنے وزیر کی یہ بات مان لی اور لکڑہارے کے لئے ایسا انتظام کرا دیا کہ وہ آرام سے دن گزارنے لگا۔

.....○○.....

بچو! یہ کہانی یہاں ختم ہوئی۔ اس کا یہ نتیجہ بالکل آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے کہ جہالت بُری بلا ہے۔ علم ہی انسان کو انسان بناتا ہے، لیکن جب میں نے ایک ہندو عالم کی زبان سے یہ کہانی سنی تھی تو ایک اور نتیجہ بھی نکلا اور وہ یہ ہے کہ اللہ پاک نے جتنے انسانوں کو بھی پیدا کیا ہے ان میں سے ہر ایک کو چندن کے جنگل سے بھی زیادہ قیمتی چیزوں کا مالک بنایا ہے۔ کوئی امیر گھرانے میں پیدا ہو یا غریب کی جھونپڑی میں سب کو عقل کا نور دیا ہے۔ آنکھیں دی ہیں۔ کان دئے ہیں۔ زبان بخشی ہے۔ ہاتھ پاؤں عطا فرمائے ہیں، غرض ایسی قوتیں دے کر دنیا میں بھیجا ہے کہ اگر وہ ان سے اچھی طرح کام لے تو شاندار کامیابیاں حاصل کر سکتا ہے، لیکن ہوتا یہ ہے کہ بس کچھ لوگ ہی اپنے چندن کے اس جنگل کی قیمت کا بالکل ٹھیک اندازہ کرتے ہیں اور اپنی قوتوں سے ٹھیک ٹھیک کام لیتے ہیں، ورنہ زیادہ ایسے ہیں جو انہیں سوکھی لکڑیوں کی طرح ضائع کرتے رہتے ہیں۔ پیارے بچوں کو ایسا نہیں کرنا چاہئے!!

علی پودے کے خلیہ کی ساخت کی وضاحت کر رہے ہیں

سائنس میلے میں

زندگی ایک میلہ ہے جہاں بہت ساری چیزیں بڑی خوب صورتی کے ساتھ سجی سنوری نظر آتی ہیں۔ زندگی کے میلے میں ایک ایسا ہی سائنسی میلہ گزشتہ دنوں گلستان شاہ عبداللطیف بوائز اسکنڈری اسکول کے طلبا نے لگایا۔ اپنے تخیل اور اپنی تعمیری سوچ کو ان پیارے پیارے طلبا نے سائنسی پروجیکٹس اور سائنسی ماڈلز کی شکل میں ڈھالا۔ چھٹی جماعت سے لے کر دسویں جماعت کے تقریباً ایک سو پچاس (۱۵۰) بچوں نے اپنی بھرپور صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک سو انتالیس (۱۳۹) ماڈلز تیار کئے جن میں سے نوے (۹۰) ماڈلز حرکت پذیر اور انچاس (۴۹) غیر حرکت پذیر یعنی ساکت تھے۔

اسکول کے پرجوش اور محنتی طلبا نے یہ سارا کام اسکول کے پرنسپل جناب رئیس الدین صدیقی صاحب اور سائنس سے تعلق رکھنے والے اساتذہ کی زیر نگرانی تیار کیا تھا۔

میلے کا افتتاح جامعہ کراچی کے شعبہ نباتیات کے پروفیسر اور رجسٹرار جامعہ جناب ڈاکٹر جمیل احمد صاحب نے کیا۔ میلے کو بچوں، دیگر اسکولوں کے اساتذہ کرام اور دیگر شعبۂ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے مہمانون نے بڑی دلچسپی، توجہ، شوق اور انتہائی نظم وضبط سے دیکھا اور مستقبل کے معماروں کی ان تعمیری کوششوں کو سراہا۔

اس سائنسی میلے میں بچوں کے بنائے ہوئے جو ماڈلز اور پروجیکٹس توجہ کا مرکز بنے رہے ان میں پاکستان کے حسین نقشے کا ماڈل، ایٹمی توانائی سے چلنے والا ایٹمی ری ایکٹر، مختلف انداز کے بنائے ہوئے

انعامات حاصل کرنے والے طلباء کا ایک گروپ

انٹر کامز، ہائیڈرو تھرمل پاور اسٹیشن، انسانی جسم اور مینڈک کے جسم میں دوران خون، ایم پلی فائر (A-mplifire) مصنوعی قلب، ٹیلی فون ایکسچینج، ردر فورڈ کا ایٹمی ماڈل (Ruther Fords Atomic Modle) ڈیجٹل کلاک، فلٹر پلانٹ، فوم کٹر، واشنگ مشین، مائیکرو اسکوپ (Micro scope) دھوپ سے چلنے والی گھڑی، کمپیوٹر، ریڈیو اسٹیشن، پیری اسکوپ، آتش فشاں، واکی ٹاکی، کرنٹ کا پتا چلانے والا آلہ، اڑنے والے ہوائی جہاز، بائیلوجی کے ساکت ماڈلز اور دلچسپ گیمز بچوں اور بڑوں کی توجہ کا مرکز بنے رہے۔ ایک طرف ننھے ڈاکٹرز بلڈ گروپ، اور بلڈ پریشر بھی چیک کر رہے تھے۔

اس دلچسپ اور معلوماتی سائنسی میلے میں بچوں کی صحت مندانہ تفریح اور تعلیمی فکر کو جلا بخشنے کا پورا انتظام کیا گیا تھا۔

منصفین کے فیصلے کے مطابق پہلا انعام اڑنے والے ہوائی جہاز اور دوسرا انعام پاکستان کے خوبصورت نقشے کے ماڈل کو، جس پر بچوں نے ایک دل میں اتر جانے والا پیغام دیا تھا، جو ہر پاکستانی کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔ پیغام یہ تھا۔ Our Co-untry and its interest is supreme (ترجمہ: "ہمارا ملک اور اس کا مفاد ہر چیز پر مقدم ہے"۔) تیسرا انعام دو مستحق ماڈلز ایک چھوٹ

زمینی زندگی اور آبی زندگی کا موازنہ کرتے ہوئے محمد علی مہمانوں کے سوالوں کے جوابات دے رہے ہیں

ضیاء الرحمٰن مینڈک کے جسم میں دوران خون کا عملی مظاہرہ پیش کر رہے ہیں اور وضاحت کر رہے ہیں

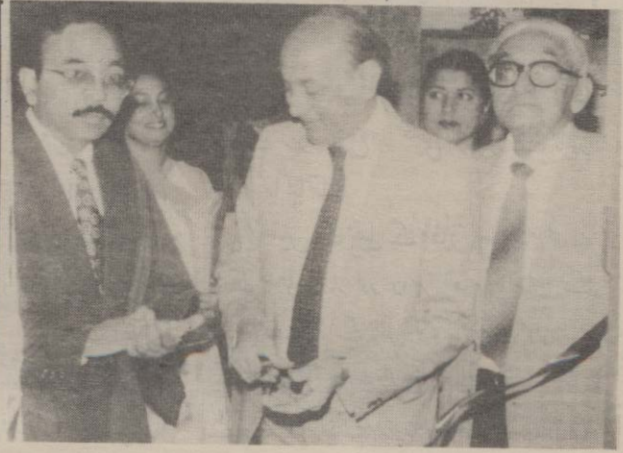

مہمان خصوصی جناب جمیل احمد صاحب سائنسی نمائش کا افتتاح کر رہے ہیں، ان کے ہمراہ پرنسپل اور جناب عبدالحمید چھوٹانی صاحب ہیں۔

واشنگ مشین اور ایک ایٹمی توانائی سے چلنے والے ایٹمی ری ایکٹر کو ملا۔ واشنگ مشین بنانے والے بچے نے باقاعدہ رومال دھو کر اور سکھا کر دکھایا جبکہ دوسرا پروجیکٹ ایٹمی توانائی سے چلنے والا ایٹمی ری ایکٹر جس میں ۲۳۵۔ U کے ایٹموں کے ٹکراؤ سے توانائی حاصل کرنے کا طریقہ بتایا گیا تھا اور یہ بھی بتایا گیا تھا کہ توانائی کن کن مقاصد کے لئے استعمال ہوتی ہے، سب لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا رہا۔

سائنسی میلے میں حصہ لینے والے تمام بچوں کو ان کی محنت، لگن، شوق اور ان کی صلاحیتوں کے اعتراف میں اعزازی سرٹیفکیٹس سے نوازا گیا۔

اس سائنسی میلے کا مقصد محض نمائش نہیں تھا بلکہ بچوں کے ذہنوں کی تعمیر و تربیت تھا۔ مستقبل کے انجینئروں، ڈاکٹروں اور موجدوں کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو ابھار کر، سنوار کر گلستان شاہ عبداللطیف بوائز اسکنڈری اسکول کے پرنسپل اور لائق اساتذہ کل کے مستقبل کی تعمیر کر رہے ہیں۔

آپریشن چڑی پھانس

قسط نمبر ۵

کوئز کہانی

اسامہ بن سلیم

کوئیز کہانی کی پانچویں قسط حاضر ہے۔ اسے غور سے پڑھیے اور کہانی میں جا بجا قصداً چھوڑی گئیں دس غلطیوں کی نہ صرف نشاندہی بلکہ اصلاح بھی کیجئے۔

اپنے جوابات ایک سادے کاغذ پر لکھ کر، ماہ رواں کی ۱۰ تاریخ تک اس کوپن سمیت ہمیں بھجوا دیجئے جو رسالے کے آخری صفحات میں موجود ہے۔ ایک سے زیادہ جوابات درست ہونے کی صورت میں قرعہ اندازی کے ذریعہ تین ساتھیوں کو انعام بھجوایا جائے گا جبکہ بقیہ ساتھیوں کا نام کامیاب شرکا کی فہرست میں شائع کیا جائے گا۔

گزشتہ ماہ شائع ہونے والی قسط کا خلاصہ

دانش، ذیشان اور حسن اپنی مسلسل کامیابیوں کے باعث پلازہ میں خاصی شہرت پا چکے تھے۔ پلازہ کے بچے بڑے سبھی انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے، سوائے ان چار شرارتی لڑکوں کے جنہیں پورا پلازہ چلٹم گروپ کے نام سے جانتا تھا۔ اسلم چنو، اسرار لمبو، رئیس ٹنڈا اور کاشف موٹو یہ چاروں لڑکے دانش، ذیشان اور حسن وغیرہ کے بلاوجہ دشمن ہو گئے تھے اور انہیں نقصان پہنچانے کی ترکیبیں سوچتے رہتے تھے۔

دوسری طرف دانش، ذیشان اور حسن بھی اس مسئلہ پر غور کر رہے تھے کہ آیا اپنی سرگرمیاں جاری رکھی جائیں یا ختم کر دی جائیں؟ تینوں ننھے سراغ رسانوں نے فیصلہ کیا کہ وہ برائی کے خلاف اپنا جہاد جاری رکھیں گے مگر فی الوقت امتحانات کی تیاری کی وجہ سے اپنی سرگرمیاں بند کر دیں گے۔ آئندہ کوئی بڑا کام کرنے کی خاطر انہوں نے ایک تنظیم بھی بنائی جس کا نام "گرین گارڈز" رکھا گیا۔

دانش، ذیشان، حسن اور انعم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر امتحان کی تیاریوں میں لگ گئے۔ امتحان ختم ہوئے تو یہ چاروں اپنے مورچے کا جائزہ لینے کے لئے پلازہ کی چھت پر گئے۔ چھت پر یہ دیکھ کر سب کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں کہ مورچے میں رکھا ہوا ان کا سارا سامان ٹوٹ پھوٹ چکا ہے اور پانی کی ٹنکی پر بڑا بڑا سا لکھا ہوا ہے "ہم تمہاری موت ہیں"۔

مورچے کا ٹوٹا پھوٹا اور جا بجا بکھرا ہوا سامان دیکھ کر دانش، ذیشان، حسن اور انعم کا حیرت اور غصّے سے بُرا حال تھا۔ ٹوٹے ہوئے سامان میں انعم کا وہ خوبصورت کھلونا بھی شامل تھا جو اسے ہما آنٹی نے اس کی سالگرہ کے موقع پہ چند روز قبل ہی دیا تھا۔ اپنا پسندیدہ کھلونا ٹوٹ جانے پر انعم کو بہت دکھ تھا۔ ان چاروں کا بس نہیں چلتا تھا کہ کسی طرح دشمن نظر آجائے اور وہ اس کی بوٹیاں نوچ لیں۔ اپنے مورچے کو انہوں نے کئی مہینوں کی محنت اور جیب خرچ سے خریدی ہوئی چیزوں سے سجایا تھا اور اب مورچے کی تقریباً ہر چیز ریزہ ریزہ ہو چکی تھی۔

مورچے کی ایسی بُری حالت ہو جانے پر سب ہی اپنے اپنے انداز سے اپنا ردِ عمل ظاہر کر رہے تھے۔ انعم غصّے سے دانت پیس رہی تھی۔ حسن اپنی ہاکی فضا میں لہرا لہرا کر دشمن کو للکار رہا تھا مگر دانش اور ذیشان کا رویّہ ان سب سے مختلف تھا۔ وہ دونوں بالکل خاموش تھے۔ انہیں چھت پر آئے

ہوئے ۱۵ منٹ سے زیادہ گزر چکے تھے مگر ان دونوں کے منہ سے ابھی تک کوئی ایک لفظ بھی نہیں نکلا تھا۔ دانش اور ذیشان بکھری ہوئی اشیا کو بغور دیکھتے ہوئے معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ذیشان کو رہ رہ کر ایس ایس پی وسیم انکل کی باتیں یاد آرہی تھیں کہ "سراغ رسانی بڑا صبر آزما اور تحمل کا کام ہے۔ جو لوگ اس طرح کے کام کرتے ہیں انہیں کبھی غصّہ نہیں آنا چاہئے۔ غصّے میں بنتے ہوئے کام بھی بگڑ جاتے ہیں اور غصہ پر قابو پا لینے سے بڑے بڑے مسئلے آسانی سے حل ہو جاتے ہیں۔"

ذیشان کے چہرے پر کوئی پریشانی نہیں تھی بلکہ وہ تو اس نئی صورت حال سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ذیشان نے دانش کو مخاطب کر کے کہا۔

"بھائی، اللہ میاں ہم پر کس قدر مہربان ہیں!"

"ہائیں! وہ کیسے؟" دانش نے حیرت سے پوچھا۔

وہ ایسے کہ، امتحان ختم ہوتے ہی، اللہ نے ہمیں ایک نئی مہم سر کرنے کا راستہ دکھا دیا۔"

ذیشان کی بات پر کچھ غور کرنے کے بعد "ہوں" کہتے ہوئے دانش نے سر ہلایا اور وہ بھی اس نئی صورت حال سے لطف لینے لگ گیا۔

دانش اور ذیشان اب تک جس نتیجے پہ پہنچے تھے وہ یہ تھا کہ، یہ واردات گزشتہ ۲۴ گھنٹوں کے دوران ہوئی ہے اور یہ کہ واردات کرنے والا کوئی باہر کا آدمی نہیں ہے۔ انہیں اس بات کا بھی یقین تھا کہ ان کے نئے دشمن کا تعلق آج تک پیش آنے والی کسی واردات سے نہیں ہے۔

"تو پھر آخر یہ نئے دشمن کون ہیں؟ مورچے کو کیوں تباہ کیا گیا ہے، اور دشمن کیا چاہتا ہے؟" یہ وہ سوال تھے، جن کے جواب تلاش کرنے کے لئے چاروں ننھے سراغ رساں اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ مصروف ہو چکے تھے۔

پلازہ کے مختلف لوگوں پر یقین کی حد تک شک ہونے کے باوجود وہ بغیر کسی ثبوت کے کسی کا نام لینا مناسب نہیں سمجھتے تھے، ذیشان کا کہنا تو یہ تھا کہ دشمن کو رنگے ہاتھوں نہ پکڑا جائے تو پھر وہ ایڈونچر ہی کیا ہوا۔ لہٰذا ذیشان اور دانش انجانے دشمنوں کو پکڑنے کے لئے نت نئی ترکیبوں پر غور کرنے لگ گئے۔

دو روز کے اندر اندر دشمنوں کو پکڑنے کا منصوبہ تیار ہو چکا تھا۔ اس منصوبے پر عمل بھی شروع

ہو گیا۔ اس منصوبے کی خاص بات یہ تھی کہ پلازہ کے چند دیگر بچے اور امی ابو بھی اس منصوبے میں شامل تھے۔ دشمن کو پکڑنے کے لئے بنائے جانے والے منصوبے کو انہوں نے "چڑی پھانس" کا نام دیا تھا۔

منصوبے کا یہ نام حسن نے تجویز کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جس طرح اکثر لوگ ٹوکرے کی مدد سے چڑیا کو اس طرح پھنسا لیتے ہیں کہ وہ ٹوکرے میں قید ہو کر بے بس ہو جاتی ہے بالکل اسی طرح ہمارے دشمن بھی ہمارے سامنے آئے بغیر پھنس جائیں گے اور ان کے پاس بھی بھاگنے کا کوئی راستہ نہ ہو گا۔

"آپریشن چڑی پھانس" کا آغاز ہو گیا۔ منصوبے کے مطابق سب سے پہلے مورچے کی تزئین کی گئی۔ نیا سامان لا کر مورچے میں سجایا گیا۔ یہ سامان کیا تھا؟ گھر کی فالتو اور بیکار اشیا جن میں خالی بوتلوں کی بڑی تعداد تھی۔ مورچہ از سر نو ٹھیک کرنے کے بعد، پانی کی ٹنکی پر بڑا بڑا سا لکھ دیا گیا۔

"بزدل دشمنو! کہاں ہو سامنے آؤ۔" اس جملے کو محض اس لئے لکھا گیا تھا کہ کسی طرح دشمن مشتعل ہو اور وہ کسی کارروائی کے ارادے سے ایک بار پلازہ کی چھت کا رخ کرے۔

ٹنکی تلے بنے ہوئے مورچے میں شیشے کی بوتلیں کیوں رکھی گئی تھیں، ان بوتلوں میں کیا تھا اور یہ کہ بوتلوں سے نکلنے والے لمبے تار ان کے فلیٹ میں کیوں جا رہے تھے؟ ان سب باتوں کا علم ابھی انعم اور حسن کو بھی نہ تھا۔ البتہ وہ یہ ضرور جانتے تھے کہ امی ابو اور مس طلعت کے مشورے سے دانش اور ذیشان نے جو منصوبہ بنایا ہے اس کا اختتام کیسی ایڈونچر فلم کی طرح بڑا ہی دلچسپ ہو گا۔

دانش اور ذیشان نے آنکھ مچولی کے کسی شمارے میں پوشید بین بنانے کا طریقہ بھی پڑھ رکھا تھا لہٰذا انہوں نے بڑی محنت سے ایک پوشید بین بنائی جسے پلازہ کی چھت پر اس طرح لگا دیا گیا تھا کہ نیچے اپنے فلیٹ میں رہتے ہوئے، وہ لوگ چھت پر ہونے والی کسی بھی حرکت کو بہ آسانی دیکھ سکتے تھے۔ رات کے وقت چھت کی ٹنکی پر ایک بلب بھی روشن کر دیا جاتا تاکہ اگر دشمن رات کے وقت مورچے پر حملہ آور ہو تو اسے پوشید بین کی مدد سے دیکھا جا سکے۔

دشمن کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کے لئے کچھ اور کام بھی کئے گئے تھے مگر انہیں ظاہر نہیں کیا گیا تھا، اس لئے کہ اس منصوبے کی کامیابی کا سارا دارومدار منصوبے کو خفیہ رکھنے میں تھا۔ مشن کو یقینی طور پر کامیاب بنانے کے لئے گھر کے سب افراد کی ڈیوٹیاں لگا دی گئی تھیں اور ہر فرد اپنے اپنے وقت پہ اپنی ذمہ داری ادا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سب سے اہم ڈیوٹی یہ تھی کہ گھر کے سب افراد اپنے اپنے

پر پوشیدہ بین کے ذریعہ چھت کا جائزہ لیتے رہیں۔

چھت پر دشمن کی آمد کا انتظار کرتے کرتے پانچ روز گزر چکے تھے مگر ابھی تک چھت پر بنے ہوئے مورچے پر کوئی بھی حملہ آور نہیں ہوا تھا۔ ہر پانچ منٹ بعد پوشیدہ بین دیکھ دیکھ کر گھر کے سب افراد بھی بیزار ہو چکے تھے۔ امّی کا خیال تھا کہ اب اس کھیل کو ختم کر دیا جائے اور خواہ مخواہ معمولی سے نقصان کی خاطر اپنے آپ کو اتنا پریشان نہ کیا جائے۔ دانش کو البتہ یقین تھا کہ ہمارے دشمن چھت پر ضرور آئیں گے اور ایک بار پھر ٹنکی تلے بنے ہوئے مورچے میں توڑ پھوڑ کی کوشش کریں گے۔

ہم ننھے سراغ رسانوں میں دانش یوں بھی بڑا تھا اور اپنی عمر سے زیادہ سمجھ دار بھی۔ دانش کی دادی اکثر کہا کرتی تھیں کہ دانش کے تو معنی ہی چست و چالاک کے ہیں، اور دانش واقعی چست و چالاک تھا بھی۔

دانش اور ذیشان نے علم حشرات الارض کی بعض کتابوں میں دشمن کو پکڑنے کے طریقے پڑھ رکھے تھے اور اب ان طریقوں کو یہاں استعمال کرنے کا وقت آچکا تھا۔

ایک ہفتہ گزر جانے پر بھی جب کوئی چھت پر نہ آیا تو گھر کے سب افراد نے یہ خیال کیا کہ شاید دشمن مورچے کو تباہ کرنے کے بعد مطمئن ہو چکا ہے لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اسے چیلنج کرنے کے لئے کس طرح یہ خبر پورے پلازہ میں عام کر دی جائے۔

دو روز کے اندر اندر دانش، ذیشان، حسن اور انعم نے اپنی اور اپنے دوستوں کی زبان سے یہ خبر پورے پلازہ میں پھیلا دی کہ "گرین گارڈز نے از سر نو اپنا مورچہ درست کر لیا ہے اور یہ کہ اب دشمن ان کے مورچے تک آنے کی ہمت نہیں کر سکتا"۔ یہ خبر پھیلتے پھیلتے ان کانوں تک بھی جا پہنچی جو مورچے کو تباہ کرنے کے اصل ذمہ دار تھے۔

چلٹم گروپ کے چاروں ارکان اسلم چنو، اسرار لمبو، رئیس ٹنڈا اور کاشف موٹو ہی وہ شریر لڑکے تھے جنہوں نے موقعہ غنیمت جان کر دانش، ذیشان، حسن اور انعم کے مورچے کو تباہ کر ڈالا تھا۔ اپنی اس حرکت پر وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ چاروں شرارتی لڑکے جب بھی دانش اور ذیشان کے قریب سے گزرتے انہیں ٹیڑھی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے گزرتے۔

دانش اور ذیشان کو بھی اب یقین ہو چلا تھا کہ اصل شرارت انہی لڑکوں کی ہے مگر وہ اس کی تصدیق ضرور چاہتے تھے۔

گرین گارڈز کے ننھے ارکان کا چیلنج جب چلٹم گروپ کے چاروں لڑکوں تک پہنچا تو وہ بے

حد مشتعل ہوئے۔ کاشف موٹو غصّے سے چلایا، "یہ چوہے ہمیں چیلنج کر رہے ہیں، ہم دیکھ لیں گے انہیں"۔

چاروں نے مورچے پر ایک بار پھر حملہ آور ہونے کی تیاریاں شروع کر دیں مگر اس بار یہ قدرے محتاط تھے۔

.....○○.....

ایک رات جب دانش، ذیشان، حسن اور انعم اپنے امّی ابو کے ساتھ، سیما آنٹی کی شادی کی تقریبات کے لئے روانہ ہوئے تو چلٹم گروپ کے اسلم چنو نے انہیں پلازہ سے روانہ ہوتے ہوئے دیکھ لیا۔ "یہ موقع غنیمت ہے۔" اسلم چنو نے سوچا اور فوراً ہی اسرار لمبو، کاشف موٹو اور رئیس ٹنڈا کو اطلاع کر دی۔ شرارتی ٹولے کے چاروں لڑکے ایک بار پھر مورچے کو تباہ کرنے کی نیّت سے پلازہ کی بالائی چھت کی طرف روانہ ہوئے، آہستہ آہستہ دبے قدموں کے ساتھ یہ چاروں سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ چاروں لڑکے اپنی دانست میں خوش ہوتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ دانش، ذیشان، حسن، اور انعم یا ان کے گھر والوں کی عدم موجودگی میں انجم صاحب کے دوست اکبر بھٹی صاحب ان کے گھر میں موجود تھے اور مسلسل پوشید بین پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ دوسری طرف پلازہ کے ایک اور بلاک کی چھت پر اعجاز انکل کی تینوں بیٹیاں، ثمرین، وردہ اور انعم ٹنکی کی اوٹ سے چھت کا جائزہ لے رہی تھیں۔

چلٹم گروپ جونہی چھت پر پہنچا، بھٹی صاحب نے پوشید بین کے ذریعہ انہیں دیکھ لیا۔ دشمن کو چھت پر موجود پا کر بھٹی صاحب کا پہلا کام چھت پہ کھلنے والے لوہے کے آہنی گیٹ کو بند کر کے تالا لگا دینا تھا۔ لہٰذا انہوں نے ایک لمحے کی تاخیر کئے بغیر چھت کا رخ کیا اور کمال آہستگی سے چھت کے دروازے کو مقفّل کر دیا۔ چھت کے دروازے کو بند کر دینے کے بعد بھٹی صاحب کا دوسرا کام دانش، ذیشان اور حسن وغیرہ کو فون پر اس کی اطلاع دینا تھا۔ اگلے ہی لمحے اکبر بھٹی صاحب فون پر ذیشان کو بتا رہے تھے کہ "آپریشن چڑی پھانس کامیاب رہا۔ چاروں چڑیاں چھت پر پھنس چکی ہیں۔" خبر کے ملتے ہی دانش، ذیشان، حسن اور انعم نے ابو کے ساتھ گھر کا رخ کیا۔

چلٹم گروپ کے ارکان اس بات سے بے خبر تھے کہ وہ بہت بری طرح پھنس چکے ہیں۔ اپنی دانست میں انہوں نے کوئی بڑا معرکہ سر کر لیا تھا اور بس اگلے ہی لمحے وہ مورچے کو تباہ کرنے والے تھے مگر اگلے لمحے کیا ہونے والا تھا یہ بات گرین گارڈز کے ارکان کے سوا کوئی اور نہیں جانتا تھا۔

کاشف موٹو نے جیسے ہی ٹنکی کی دیوار پر پڑھا "کہاں ہو بزدل دشمنو، سامنے آؤ۔" تو

اس نے ایک زور دار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا..... "چار چوہو! ہم آگئے ہیں، دیکھو ہم آگئے ہیں۔" یہ کہتے ہی اس کے جوتے چھت کے فرش سے چپک کر رہ گئے۔

چڑی پھانس منصوبے کی رُو سے چھت پر سب سے پہلے گوند نما محلول کی تہہ بچھادی گئی تھی تاکہ آنے والوں کے جوتے اس میں چپک جائیں چلتم گروپ کے چاروں ارکان بڑی مشکل سے اپنا ایک قدم اگر اس محلول سے نکال بھی پاتے تو اگلا قدم نکالنا مشکل ہو جاتا۔ کاشف موٹو، اسرار لمبو، رئیس ٹنڈا اور اسلم چنو، اس نئی صورت حال سے بے حد پریشان تھے۔ بڑی مشکل سے وہ اس محلول سے نکلنے میں کامیاب ہوئے مگر وہ بھی اس طرح کے انہیں اپنے جوتے وہیں چھوڑنے پڑے۔

پاؤں میں چپکنے والے محلول سے یہ لوگ ابھی نکل بھی نہ پائے تھے کہ اگلے حصے میں بچھے ہوئے مٹی نما سفوف نے ان کے پاؤں میں جلن اور بے چینی پیدا کرنا شروع کر دی۔ ان چاروں کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے انہوں نے اپنے پاؤں انگاروں پر رکھ دیئے ہوں۔ مختلف کیمیکلز کا یہ استعمال دانش اور ذیشان نے بائیولوجی کی کتابوں میں پڑھا تھا اور آج ان کے استعمال کا عملی مظاہرہ پلازہ کی چھت پر ہو رہا تھا۔

کیمیائی سفوف نے چاروں شرارتی لڑکوں کے پاؤں میں آگ سی لگا دی تھی اور وہ سب کے سب کسی مسخرے ڈانسر کی طرح بے چینی سے رقص کر رہے تھے۔

پاؤں جلانے والے سفوف سے نکل کر چاروں نے غصّے کے عالم میں پتھر اور لوہے کی سلاخوں سے مورچے کے سامان کو توڑنا شروع کر دیا۔ مورچے میں رکھی ہوئی کانچ کی بوتلیں جیسے ہی ٹوٹیں ان میں بھری ہوئی چھپکلیاں، لال بیگ اور ہزاروں کی تعداد میں کیڑے مکوڑے چھت کی فرش پر پھیل گئے۔

اس نئی صورتحال نے چاروں کے اوسان خطا کر دیئے۔ کئی لال بیگ کاشف موٹو اور اسرار لمبو کی شلوار میں گھس چکے تھے اور وہ بے چینی سے اچھل بھی رہے تھے اور بُری طرح چیخ بھی رہے تھے۔ اسلم چنو اور رئیس ٹنڈا کا ہانپ ہانپ کے بُرا حال ہو چکا تھا۔

اس عرصے میں دانش، ذیشان، حسن اور انعم وغیرہ بھی پلازہ پہنچ چکے تھے۔ دانش حسن اور ذیشان اپنی غلیلوں سمیت فوراً ہی دوسرے بلاک کی چھت پر جا پہنچے اور تاک تاک کر چلتم گروپ کا نشانہ لینے لگے۔ رات کو اندھیرا ہونے کے باعث گرین گارڈز کے ارکان کو دیکھنا ممکن نہ تھا البتہ مورچے والی چھت پر روشن بلب کی وجہ سے ان چاروں کو دیکھنا بے حد آسان تھا۔

چلتم گروپ کو کیڑوں مکوڑوں نے ہی کافی پریشان کر رکھا تھا، کجا یہ کہ وہ مزید پتھروں کی

بارش کا بھی سامنا کرتے۔ وہ چاروں واپس جانے کے لئے بھاگے مگر ایک بار پھر انہیں پاؤں جلانے والے سفوف اور چپکنے والے محلول سے واسطہ پڑا۔ بڑی مشکلوں سے وہ سیڑھی کے دروازے تک پہنچے بھی تو دروازہ بند تھا۔ اس صورتحال نے ان کی حالت خراب کر دی تھی۔ غلیل سے برسائے گئے پتھروں نے ان کے سروں پر گومڑے ڈال دیئے تھے۔ پلازہ کی ۶۰ فٹ اونچی چھت سے اترنے کا کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ اب مجبوراً وہ "بچاؤ بچاؤ" کی آوازیں لگا رہے تھے اور ان کی چیخ وپکار سن کر پلازہ کے بہت سے لوگ گھروں سے باہر آچکے تھے۔

تھوڑی دیر بعد چھت کا دروازہ کھلا تو چاروں شرارتی لڑکے، اسے نجات کا واحد راستہ سمجھ کر اس طرف لپکے مگر یہ کیا!! سیڑھیوں پر پولیس کے جوان کھڑے تھے۔

پریشان حال چاروں تخریب کار پولیس کی حراست میں تھے اور پولیس کے جوان تھانے میں ان سے یہ اگلوانے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ اور کیا کیا کچھ کرتے رہے ہیں۔

تفتیش پر پتہ چلا کہ پلازہ میں ہونے والی چوری کی کئی وارداتوں میں یہی چاروں افراد ملوث رہے ہیں۔

جتنا عرصہ یہ چاروں حوالات میں رہے۔ پلازہ کے مکینوں نے سکھ کا سانس لیا، اس لئے کہ ان کی آئے دن کی وارداتوں نے لوگوں کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔

.....○○.....

"آپریشن چڑی پھانس" نہایت کامیاب رہا تھا اور گرین گارڈز کے چاروں ارکان اس کامیابی پر بے حد خوش تھے۔ خوشی کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ اس منصوبے میں یہ چاروں بچے کہیں بھی سامنے نہیں آئے تھے۔

اس کامیاب آپریشن کی خوشی میں ایک دعوت کا اہتمام بھی کیا گیا جس میں بھٹی صاحب، اعجاز صاحب، ثمرین، وردہ، انعم اور کچھ رشتے دار بھی شریک ہوئے۔

اکبر صاحب نے گرین گارڈز کے ارکان کو بچوں کے جاسوسی کہانیاں لکھنے والے مشہور ادیب اشفاق احمد کی دس کتابوں کا سیٹ تحفے میں دیا۔ اعجاز صاحب نے بائیو گیس سے چلنے والا منی کمپیوٹر اور امّی نے بھی بچوں کو مشہور شاعر مشتاق یوسفی کا مجموعہ کلام زرگزشت تحفے میں دیا۔

ابّو نے بچوں کو آنکھ مچولی وڈیو میگزین دلوانے کے علاوہ یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں بچوں کو پاکستان کی سیر کروانے لے جائیں گے خصوصاً وادیٔ کشمیر کی مشہور جھیل سیف الملوک، لاہور میں واقع منگلا ڈیم، کوئٹہ کی تفریح گاہ شکر پڑیاں اور ساہیوال کا ہرن مینار ضرور

دکھائیں گے۔

یہ سنتے ہی سب بچوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے انہوں نے "ابّو زندہ باد" کا نعرہ لگایا اور ابّو سے لپٹ گئے۔

گزشتہ ماہ شائع ہونے والی کوئز کہانی کے درست جوابات

(۱) ...... نظریہ ارتقاء کا تعلق فزکس سے نہیں بائیلوجی سے ہے۔

(۲) ...... نظریہ اضافت کا تعلق آئین اسٹائن سے ہے۔

(۳) ...... اصول حرکت کا تعلق ارشمیدس سے نہیں نیوٹن سے ہے۔

(۴) ...... مومن خان مومن افسانہ نگار نہیں شاعر تھے۔

(۵) ...... نائٹ انگیل کا تعلق نہ تو امریکہ سے تھا اور نہ وہ آرٹسٹ تھیں بلکہ ان کی شہرت کا حوالہ نرس کی حیثیت سے بیماروں کی خدمت ہے۔

(۶) ...... ایڈیسن موسیقار نہیں سائنس دان اور موجد تھا۔

(۷) ...... نیرو دوسری جنگ عظیم کا ہیرو نہیں تھا۔ اس جنگ میں ہٹلر نے شہرت پائی۔

(۸) ...... گولڈا میئر اس طرح اندھی گونگی اور بہری نہیں تھی جس طرح ہیلن کیلر تھیں۔

(۹) ...... جیف ہنٹ اسکوائش کا کھلاڑی ہے کرکٹ کا نہیں ہے۔

(۱۰) ...... امام شامل نے امریکہ میں نہیں روس میں آزادی کے لئے گوریلا جنگ کی۔

کوئز کہانی (۴) نئے دشمن تمام درست جواب دینے والے ساتھیوں کے نام

(۱) ...... شیراز احمد	ناظم آباد کراچی
(۲) ...... عنبرین گلزار علی	گارڈن (ویسٹ) کراچی
(۳) ...... محمد سعد فیصل	رحیم یار خان
(۴) ...... ارجمند جبین	کراچی
(۵) ...... فطین مبارک	ڈرگ کالونی، کراچی
(۶) ...... خرّم شیرازی	بھکر
(۷) ...... محمد محسن	نواب شاہ

قرعہ اندازی کے ذریعے انعام پانے والے ساتھیوں کے نام

اول:۔	ولی اللہ کاشان	گلشن حدید، کراچی
دوم:۔	نازیہ سید نازی	بھکر سٹی
سوم:۔	ارسلان بابر	بہاولپور، پنجاب

ساتھی جنہوں نے صرف ایک غلطی کی

(۱) ...... سارہ باوید نذیر	کراچی
(۲) ...... سید نعیم الحق	کراچی
(۳) ...... ثمرہ اختر زبیری	کراچی
(۴) ...... راجہ نعیم شوکت	کراچی
(۵) ...... اطہر رضا	کراچی
(۶) ...... وحید عامر	بوریوالہ
(۷) ...... بلال علی خان	بہاولپور
(۸) ...... محمد ثوبان غلزئی	نامعلوم مقام

ایک مباحثے کا حال

اکبر علی خان عرش زادہ

کل شام مدرسے میں اپنے مُباحثہ تھا
تقریر کرنے والوں کا اک مُقابلہ تھا
تھے تین اک طرف سے اور تین اک طرف سے
سنتے تھے چھے کے چھے ہی ماہر تھے بولنے کے
جلسے میں سب سے پہلے عبدالصبور بولے
پھر ان کے بعد بھائی عبدالشکور بولے
عبداللطیف کو ہاں کیا ہوگیا نہ جانے
بالکل نہ کہہ سکے کچھ مت[1] ہی نہ تھی ٹھکانے
عبدالودود نے کچھ کوشش ضرور کی تھی
تقریر ان کی لیکن یونہی سی رہ گئی تھی
عبدالسلام ایسے گھبرائے جارہے تھے
جو چاہتے تھے کہنا کہنے نہ پا رہے تھے
عبدالعلیم کو ہو شاباش چھا گئے وہ
انعام انہی نے پایا اور اوّل آگئے وہ

[1] عقل

پی سی ایم ایس

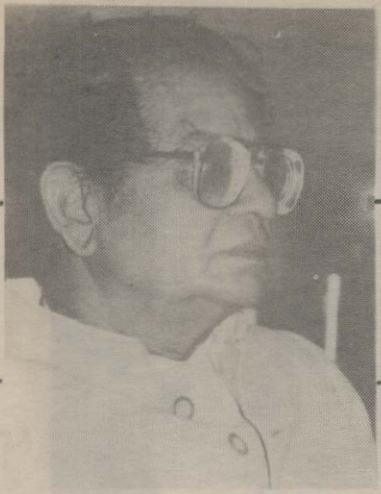

بچوں کے رسائل کی پہلی قومی تنظیم

جاری کردہ: پاکستان چلڈرز میگزین سوسائٹی

پی سی ایم ایس کے سرپرست جناب مسعود احمد برکاتی صاحب

پاکستان میں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ بچوں کے رسائل کے مالکان یا مدیران سر جوڑ کر بیٹھیں اور رسائل کے علاوہ اپنے قارئین یا قلمکاروں کی بھلائی کے لئے کچھ اہداف مقرر کریں اور مل جل کر ان تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ یہ اعزاز یقیناً انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد کو جاتا ہے جس نے زندگی کے دیگر شعبوں کے علاوہ بچوں کے لٹریچر کی اہمیت کو بھی سمجھا اور اس سمت کئی مثبت قدم اٹھائے۔

اس یونیورسٹی کے معروف ترین شعبے، دعوۃ اکیڈمی میں بچوں کا باقاعدہ ایک شعبہ ہے جس کے نگراں افتخار کھوکھر صاحب ہیں۔ اکیڈمی کے سربراہ ڈاکٹر محمود غازی صاحب ہیں۔ غازی صاحب سے قبل ڈاکٹر انیس صاحب اس اکیڈمی کے سربراہ تھے، انہی کے دور میں بچوں کے ادب و رسائل پر مختلف نوعیت کے سیمینارز اور ورکشاپ وغیرہ کے انعقاد کا سلسلہ شروع ہوا۔ بعد ازاں ڈاکٹر محمود غازی صاحب نے اسی شعبے میں اپنی بھرپور دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہوئے، اس کام کو آگے بڑھایا۔

ایسے ہی ایک موقعہ پر جب پاکستان بھر سے بچوں کے مختلف رسائل کے مدیران ایک سیمینار میں شرکت کے لئے اسلام آباد آئے ہوئے تھے۔ تمام مدیران نے مل جل کر یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں بچوں کے رسائل کی ایک ایسی ملک گیر تنظیم بنانی چاہئے جو نہ صرف بچوں کے رسائل کی مختلف مشکلات کو حل کرے بلکہ اپنے پڑھنے والوں اور لکھنے والوں کے لئے بھی ایسے مواقع فراہم کرے جس سے ان کی صلاحیتوں کی نشوونما ہو اور ان کے ذوق مطالعہ کی بہتر تسکین ہو اور بامقصد سرگرمیوں کے ذریعہ وہ زندگی کی جدوجہد میں

مختلف رسائل کے مدیران ، ڈاکٹر محمود غازی ، غلام ربانی آگرو صاحب کے ساتھ

بہتر انداز سے آگے بڑھنے کے قابل بھی ہو سکیں۔

سرسبز و شاداب درختوں سے لدے ہوئے حسین پہاڑوں کے دامن میں واقع مارگلہ موٹلز میں تمام مدیران رسائل نے مل جل کر اس تنظیم کی بنیاد رکھی جس کا نام ابتدا میں " آل پاکستان چلڈرن ایڈیٹرز ایسوسی ایشن " رکھا گیا۔ کنوینر جناب فاروق اعجاز صاحب کو بنایا گیا جب کہ اس کی سرپرستی تعلیم و تربیت کے ڈاکٹر عبدالرؤف صاحب اور نونہال کے مسعود برکاتی صاحب نے قبول کی۔

جو مدیران اس میٹنگ میں شریک ہوئے ان میں جناب مسعود برکاتی (نونہال) جناب ڈاکٹر عبدالرؤف (تعلیم و تربیت) سلیم مغل (آنکھ مچولی) فاروق اعجاز (بچوں کا ڈائجسٹ) سلیم شرفپوری (بچوں کی دنیا) یوسف صاحب (جگنو) ڈاکٹر نسیم الدین خواجہ (کوثر) مصطفیٰ چاند (بچوں کا رسالہ) اشتیاق احمد (چاند ستارے) ظہور بٹ (ذہین) قاضی سراج (ساتھی) ثاقب نعیم (پیغام) معروف ادیب مقبول انور داؤدی اور چند دیگر رسائل کے مدیران بھی شریک ہوئے۔

جون ۱۹۹۱ء میں ایک بار پھر جب دعوۃ اکیڈمی نے تمام مدیران کو اسلام آباد مدعو کیا تو ایسوسی ایشن کی سال بھر کی کارروائی کا جائزہ لینے کا موقعہ میسر آیا۔ یہ جائزہ زیادہ اطمینان بخش نہ تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ایسوسی ایشن کے کچھ عہدیدران لاہور سے متعلق تھے اور کچھ کراچی سے متعلق، گویا کراچی اور لاہور کی لمبی مسافتیں یا تمام عہدیداران کا باہم نہ مل سکنا آڑے آیا۔ ایسوسی ایشن کے نام پہ بھی بعض

تکنیکی اعتراضات ہوئے۔

گزشتہ سال کی کارکردگی کی روشنی میں کچھ نئے فیصلے کئے گئے۔ تنظیم نو کا مرحلہ آیا تو یہ طے پایا کہ اس تنظیم کے تمام عہدیداران ایک ہی شہر سے منتخب کئے جائیں تاکہ ان کے نہ مل سکنے کا کوئی جواز پیدا نہ ہو سکے۔اس طرح سال ۹۲۔ 1991 کے لئے تنظیم کو مکمل طور پر کراچی منتقل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ نونہال کے مسعود احمد برکاتی صاحب کو سرپرست اور آنکھ مچولی کے مدیر اعزازی سلیم مغل صاحب کو تنظیم کا صدر منتخب کیا گیا۔ بقیہ عہدیداران کی نامزدگی صدر پر چھوڑ دی گئی اور یہ بھی کہ تنظیم کے حتمی نام کا فیصلہ بھی کراچی کے عہدیدران مل جل کر کریں گے۔

کراچی میں رسائل کی مشترکہ تنظیم کے عہدیدران کی میٹنگ جناب برکاتی صاحب کی صدارت میں اور انہی کے دفتر میں ہوئی۔ محمود شام صاحب، سلیم مغل، قاضی سراج اور نعمان شیخ اس میٹنگ میں شریک ہوئے۔

میٹنگ میں جو اہم فیصلے کئے گئے۔ وہ درج ذیل ہیں۔

گزشتہ دنوں کراچی کے بچوں کے رسائل کے مدیران کا ایک اجلاس جناب مسعود احمد برکاتی (مدیر ماہنامہ نونہال) کی زیر صدارت ہوا۔ جس میں بچوں کے رسائل کی تنظیم کے حوالے سے طویل گفتگو اور بحث کے بعد درج ذیل امور طے کئے گئے۔

تنظیم کا نام..... پاکستان بھر سے شائع ہونے بچوں کے رسائل کی تنظیم کا نام "پاکستان چلڈرن میگزینز سوسائٹی (P.C.M.S)" تجویز ہوا۔

اغراض و مقاصد..... سوسائٹی کے اغراض و مقاصد درج ذیل طے پائے۔

(۱)..... بچوں کے رسائل کی ترقی، فروغ اور استحکام کے لئے تمام ممکنہ ذرائع استعمال میں لانا۔

(۲)..... بچوں کے رسائل کی مشکلات اور مسائل کو حل کرنا۔

(۳)..... بچوں کے رسائل کی افادیت و اہمیت کو معاشرے اور حکومت سے تسلیم کرانے کی جدوجہد کرنا۔

(۴)..... بچوں کی فلاح و بہبود کے لئے مختلف عالمی اور سرکاری و غیر سرکاری اداروں کا تعاون حاصل کرنا۔

(۵)..... بچوں کے رسائل کے باہمی تعاون میں اضافہ کرنا۔

(۶)..... بچوں کے رسائل میں لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی اور راہنمائی کے مواقع فراہم / تلاش کرنا وغیرہ۔

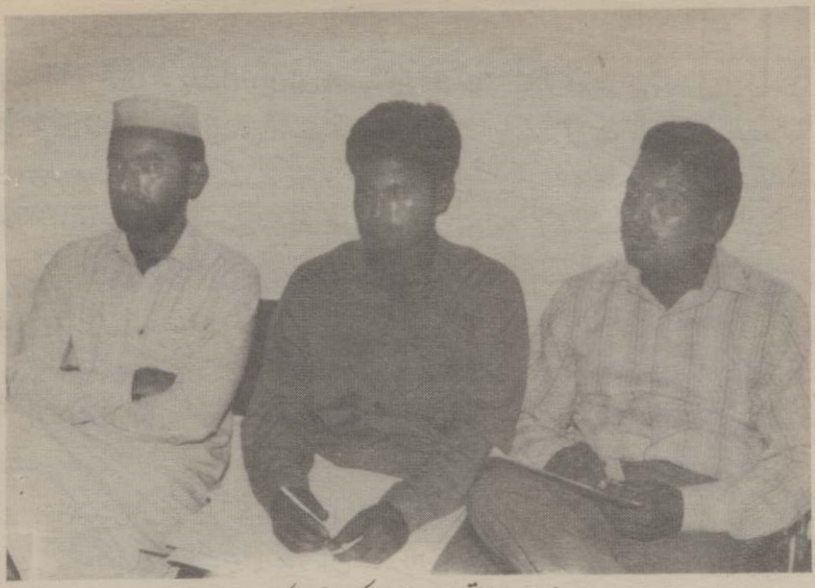

پیغام، ساتھی اور بچوں کی باجی کے مدیران

شرائط برائے رکنیت

..... صرف ایسے رسائل سوسائٹی کے ممبر بن سکتے ہیں جو،

(۱) ..... صرف بچوں کا ادب یا تحریری مواد پیش کرتے ہوں۔

(۲) ..... کم از کم مسلسل چھ ماہ سے شائع ہو رہے ہوں۔

(۳) ..... اسلام اور پاکستان کے خلاف مواد فراہم یا شائع نہ کرتے ہوں۔

(۴) ..... قومی مفادات کے خلاف مواد نہ شائع کرتے ہوں۔

(۵) ..... سوسائٹی کی ممبر شپ فیس ۔/۱۰۰ روپے اور سالانہ فیس ۔/۵۰۰ روپے ہوگی۔ جس کی ادائیگی سال ۱۹۹۲ء کے لئے ماہ جنوری ۱۹۹۲ء میں کرنا ہوگی۔

(۶) ..... ہر سال کی فیس سال کے پہلے ماہ میں جمع کرانا ہوگی۔

(۷) ..... جو رسائل مسلسل چھ ماہ تک شائع نہ ہوں ان کی رکنیت خود بخود ختم ہو جائے گی۔ اور فیس واپس نہ کی جائے گی۔

(۸) ..... رکن سوسائٹی اپنے پرچے دوسرے رسائل کو ارسال کریں گے۔

چند دیگر امور

○ ..... علاقائی رسائل کی رکنیت فیس میں ۵۰ فیصد رعایت ہوگی۔

○ ..... رسائل کے نام حروف تہجی کے اعتبار سے (ہر جگہ) لکھے جائیں گے۔

○ ..... سال نو (۱۹۹۲) کے آغاز پر تمام رسائل سوسائٹی کا تعارف اور اغراض و مقاصد شائع کریں گے۔

○ ..... تمام رسائل اپنے از ٹائٹل پر سوسائٹی سے اپنے تعلق کی تعارفی سطر شائع کریں گے۔

○ ..... تمام رسائل سوسائٹی کی جانب سے دیئے جانے والے مضامین یا غیر تجارتی اور با مقصد اشتہارات کو بغیر کسی معاوضے کے شائع کریں گے۔

○ ..... جب تک سوسائٹی کا دستور نہیں بن جاتا اور باقاعدہ انتخاب نہیں ہو جاتے۔ تنظیم کا مرکز اور مرکزی عہدیداران ایک سال کراچی اور ایک سال لاہور سے ہوں گے جبکہ دیگر شہروں کے لئے نمائندگی کا تقرر کیا جائے گا۔

○ ..... سال میں کم از کم ایک بار تمام مدیران باہم یکجا ہو کر آئندہ سال کے اہداف طے کریں گے اور گزشتہ سال کی کارروائی کا جائزہ لیں گے۔

○ ..... تمام رسائل سوسائٹی کے پتے پر اپنے رسائل ہر ماہ باقاعدگی سے بھجوائیں گے۔

عہدیدران

برائے جون ۹۱ء تا جون ۹۲ء

□ ..... سرپرست ..... جناب مسعود احمد برکاتی (ماہنامہ ہمدرد نونہال)

□ ..... صدر ..... جناب محمد سلیم مغل (ماہنامہ "آنکھ مچولی" کراچی)

□ ..... نائب صدر ..... جناب محمود شام (ماہنامہ "ٹوٹ بٹوٹ" کراچی)

□ ..... جنرل سیکریٹری ..... محترمہ فرشتے ڈنشاء۔ (ماہنامہ فن لائن کراچی۔ انگریزی)

□ ..... سیکریٹری نشر و اشاعت ..... جناب قاضی سراج (ماہنامہ "ساتھی" کراچی)

□ ..... سیکریٹری مالیات ..... (جناب نعمان شیخ)

☐ .... **نمائندہ لاہور** .... جناب ظہور بٹ (ماہنامہ "ذہین" لاہور)

☐ .... **نمائندہ اسلام آباد** .... جناب عاکف (ماہنامہ "فاختہ" اسلام آباد)

سوسائٹی کا قیام عمل میں آچکا ہے۔ سوسائٹی اپنے سامنے کچھ اہداف بھی رکھتی ہے۔ کم سے کم وقت میں طے شدہ امور کو عملی جامہ بھی پہنانا ہے۔

○ .... توقع ہے کہ سوسائٹی بہت جلد یونیسیف کے تعاون سے پاکستان بھر کے مدیران رسائل کو کراچی بلانے کا اہتمام کرے گی۔ بچوں تک تعلیم اور صحت کا پیغام پہنچانے کے لئے یونیسیف کے تعاون سے ایک پروگرام کو حتمی شکل دینے کی کوشش کی جارہی ہے۔

○ .... وزارت مذہبی امور کے سیکریٹری جناب مظہر رفیع صاحب نے پاکستان بھر کے بچوں کے مابین ایک تحریری مقابلے کے انعقاد میں بھی تعاون کا وعدہ کیا ہے۔ پیش رفت سے بہت جلد آگاہ کر دیا جائے گا۔

○ .... آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی (APNS) کے صدر جناب مجید نظامی صاحب کو ایک خط بھجوایا گیا ہے جس میں درخواست کی ہے کہ وہ بچوں کے ادیبوں اور بچوں کے بہترین رسائل کی حوصلہ افزائی کے لئے وفاقی سطح پر حوصلہ افزائی کی کوئی صورت پیدا کریں۔

○ .... سوسائٹی کا وفد وفاقی وزیر اطلاعات اور دیگر متعلقہ افسران سے مل کر رسائل کے مالی بوجھ کو کم کرنے اور سرکاری اشتہارات کے باقاعدہ حصول کے لئے بھی کچھ کرنا چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں کئی پروگرام زیر غور ہیں۔

توقع ہے کہ سوسائٹی آپ کو بہت جلد اچھی اچھی خبریں سنائے گی۔

سوسائٹی اپنے قارئین اور قلم کاروں سے بھی توقع رکھتی ہے کہ وہ اپنی تجاویز کے ساتھ ہماری راہنمائی کریں گے۔

رسائل سے اگر کوئی شکایت ہے تو قارئین سوسائٹی کو لکھیں، سوسائٹی ہر ممکن کوشش کرے گی کہ آپ کے تعاون اور آپ سے تعاون کے ذریعہ اپنے مقاصد کو جلد از جلد حاصل کر سکے۔

فی الوقت سوسائٹی کا پتہ وہی ہے جو ماہنامہ آنکھ مچولی کا ہے۔

یعنی ...... پی آئی بی کالونی، کراچی ۵، ۴۱۱۵۸۷

لکھنے سے پہلے پڑھنے کی باتیں

آنکھ مچولی کا یہ شعبہ مختصر تحریروں پر مبنی ہے۔ ضروری نہیں کہ اس میں نئے لکھنے والوں ہی کی تحریریں شامل ہوں۔ بڑی عمر کے قلم کار بھی اس حصے کے لئے مختصر تحریریں بھجوا سکتے ہیں۔

لیک بات یاد رکھئے کہ تحریر جس قدر مختصر ہوگی اس قدر جلد شائع بھی ہو سکے گی۔ اسی طرح تخلیقی یا طبع زاد تحریروں کو دوسری تحریروں پر فوقیت دی جاتی ہے۔ آپ بھی کوشش کیجئے کہ آپ جو کچھ بھی لکھیں وہ آپ کا اپنا ہو خواہ اس کا معیار کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ ادارہ آنکھ مچولی کی کوشش ہوتی ہے کہ کمزور تحریروں کو بہتر بنا کر شائع کرے۔ معلومات اور مضامین وغیرہ میں گھسی پٹی چیزیں بھیجنے سے گریز کریں۔ اس سیکشن کو بہتر سے بہتر تر بنانے کے لئے ہم آپ کی تجاویز کا خیر مقدم کریں گے۔

مُرسلہ: محمد حسین، کراچی

کرنے والی فلارنس نائٹ انگیل

یہ خاتون ۱۲ مئی ۱۸۲۰ء کو اٹلی کے شہر فلارنس میں پیدا ہوئی لیکن اس کا بچپن زیادہ تر انگلستان میں بسر ہوا۔ اس کی نیک ماں نے اسے خدمت خلق میں زندگی بسر کرنے کا مشورہ دیا، چنانچہ اس نے لندن، ایڈنبرا اور یورپ کے بعض ہسپتالوں کا گھوم پھر کر معائنہ کیا اور پیرس اور گائزرزورتھ کے اداروں میں نرسنگ کی تربیت بھی حاصل کی۔ ۱۸۵۸ء تک اسے اتنی شہرت حاصل ہو چکی تھی کہ وہ لندن میں مریض خواتین کے ہسپتال کی سپرنٹنڈنٹ مقرر کر دی گئی لیکن جنگ کریمیا میں اس نے وہ کام کیا کہ وہ دنیا بھر میں مشہور ہو گئی۔ اس جنگ کے آغاز میں جب معلوم ہوا کہ زخمی سپاہیوں کی دیکھ بھال ٹھیک طور سے نہیں ہو رہی ہے تو مس نائٹ انگیل نے وزیر جنگ کو جو بچپن کے زمانے سے اس کے دوست تھے، اپنی خدمات پیش کیں اور اڑتیس دوسری نرسوں کو لے کر کریمیا روانہ ہو گئی۔ اس کا کام یہ تھا کہ تمام فوجی ہسپتالوں کی نگرانی کرے، نرسوں کے پورے عملے سے کام لے اور دس ہزار مریض اور زخمی انسانوں کی دیکھ بھال کرے۔

وہ چوبیس گھنٹے کام میں مصروف رہتی، ہسپتالوں اور بارکوں کو صاف کراتی، مریضوں کے بستروں پر خود چکر لگاتی اور جتنا وقت ملتا اس کو آپریشن کے کمروں میں مجروح انسانوں کی تسکین و تسلی میں صرف کرتی۔ فروری اور جون ۱۸۵۵ء کے درمیان اس کی انتھک کوششوں کے باعث شرح اموات ۴۲ فیصد سے گھٹتے گھٹتے صرف دو فیصد رہ گئی۔ اگرچہ وہ خود بخار میں مبتلا ہو گئی، لیکن اپنے کام میں برابر مصروف رہی۔ انگریزوں نے جولائی ۱۸۵۶ء میں ترکی خالی کر دیا۔ اس وقت تک اس کے عظیم الشان کام کی اتنی شہرت ہو چکی تھی کہ حکومت برطانیہ نے اس کو وطن واپس لانے کے لئے خاص طور پر ایک جنگی جہاز بھیجا۔

مس نائٹ انگیل کی خدمات کے اعتراف کے طور پر پچاس ہزار پاؤنڈ کا ایک فنڈ جمع کیا گیا جس سے اس نے سینٹ ٹامس ہسپتال میں ایک دارالتربیت قائم کیا جس کا نام تھا، "نائٹ انگیل نرسز ٹریننگ ہوم۔" اس کے علاوہ بعض دوسرے مقامات پر بھی نئے انداز کے نرسنگ اسکول کھولے۔

مس فلارنس نائٹ انگیل کا انتقال لندن میں ۱۳ اگست ۱۹۱۰ء کو ہوا۔ اس نے نوے سال کی عمر پائی۔

چکوال

مرسلہ: شکیل عباس، چکوال

چکوال ایک قدیم شہر ہے اس کو ۱۹۸۵ء میں ضلع کا درجہ ملا۔ چکوال قدرتی معدنیات سے مالا مال ہے۔ بلکسر جو کہ چکوال سے ۱۸ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے، یہاں سے ۱۹۴۰ء سے وافر مقدار میں تیل نکالا جارہا ہے۔ اس کے علاوہ چکوال کے گرد و نواح سے بھی تیل نکلتا ہے۔ جن میں جویامیر، میال، ڈھلیاں مشہور ہیں۔

چکوال کے قریب چوآسیدن شاہ سے وافر مقدار میں کوئلہ نکالا جاتا ہے۔ چکوال کے قریبی علاقوں میں کلر کہار قابل ذکر قدرتی تفریحی مقام ہے۔ موسم سرما میں یہاں پر کثرت سے مرغابیاں آتی ہیں جو کہ کلر کہار جھیل کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کر دیتی ہیں یہ پاکستان کا واحد مقام ہے جہاں مور بکثرت قدرتی ماحول میں رہتے ہیں۔

اس کے علاوہ کٹاس بھی اہم مقامات میں شامل ہوتا ہے۔

لپ اسٹک

مرسلہ: محمد بلال بخاری، کوٹ ادو

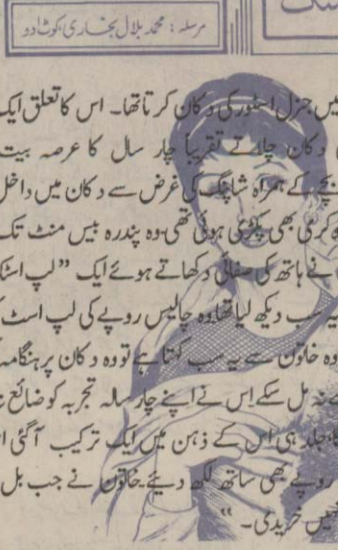

محمد احسان شہر کے بڑے چوک میں جنرل اسٹور کی دکان کرتا تھا۔ اس کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا۔ اسے جنرل اسٹور کی دکان چلاتے تقریباً چار سال کا عرصہ بیت چکا تھا۔ ایک مرتبہ ایک خاتون چار پانچ سال کے بچے کے ہمراہ شاپنگ کی غرض سے دکان میں داخل ہوئیں، انہوں نے اپنے ہاتھ سامان بھری ایک ٹوکری بھی پکڑی ہوئی تھی وہ پندرہ بیس منٹ تک مختلف چیزیں خریدتی رہیں اسی اثنا میں ان خاتون نے ہاتھ کی صفائی دکھاتے ہوئے ایک "لپ اسٹک" کی ڈبی اپنی ٹوکری میں رکھ دی احسان نے یہ سب دیکھ لیا تھا وہ چالیس روپے کی لپ اسٹ کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ خاتون سے یہ سب کہتا ہے تو وہ دکان پر ہنگامہ کھڑا کر دے گی۔ اس طرح لپ اسٹک شاید اسے نہ مل سکے اس نے اپنے چار سالہ تجربہ کو ضائع نہ جانے دیا اور ذہن سے کوئی ترکیب نکالنے لگا جلد ہی اس کے ذہن میں ایک ترکیب آگئی اس نے بل بناتے ہوئے لپ اسٹک کے چالیس روپے بھی ساتھ لکھ دیئے۔ خاتون نے جب بل دیکھا تو بولیں۔ "مگر یہ لپ اسٹک تو میں نے نہیں خریدی۔"

آپ اپنی ٹوکری میں دیکھیں شاید بچے نے بھول کر رکھ دی ہو۔" احسان نے بڑی چالاکی سے کہا لیکن خاتون نہ مانیں چند منٹ کی تکرار کے بعد مجبوراً خاتون نے اپنی ٹوکری میں دیکھا تو لپ اسٹک وہاں موجود تھی انہوں نے پورا بل ادا کیا اور جلدی سے بچے کو لے کر دکان سے باہر نکل گئیں اس طرح احسان نے عقل مندی اور اپنے تجربے سے ایک مسئلے کو آسانی سے حل کر لیا۔

گھر میں میری نئی سائیکل کیا آئی بھونچال آگیا۔ ہر فرد خصوصاً میرے چہرے پر خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ محلے میں کسی کے پاس بھی ایسی سائیکل نہ تھی۔ اس وقت میرے بھائیوں نے محلے کے لڑکوں کو جمع کیا ہوا تھا اور وہ سب سائیکل کو گھیرے کھڑے تھے اور میں سائیکل کے پاس کھڑا اس کی خوبیاں گنوا رہا تھا، جبکہ ابو جان کا موڈ کچھ آف تھا کیونکہ جاتے وقت ان کا جیب کسی پولیس آفیسر کے پیٹ کی مانند پھولی ہوئی تھی اور آتے وقت کسی قحط زدہ افریقی باشندے کی مانند پچکی ہوئی، لیکن مجھے اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ مجھے اپنی سائیکل مل چکی تھی۔ سب سے اچھی چیز جو مجھے لگی وہ اس کا تالا تھا۔ کافی دیر تک میں اس کے ہینڈل اور انوکھے تالے کے قصیدے بیان کرتا رہا اور پھر یہ "سائیکل تماشہ" ختم کر کے سائیکل لے آیا۔ امی نے نصیحتوں کی پنڈی کھول کر بولنے لگیں۔ "صفائی روز کرنی پڑے گی ورنہ زنگ لگ جائے گا۔ تالا لگائے بغیر سائیکل باہر نہیں چھوڑنی۔ چور کاریں اڑا لے جاتے ہیں۔ یہ سائیکل کیا چیز ہے۔" وغیرہ وغیرہ (یہ اور بات ہے کہ میرے کان پر جوں تک نہ رینگی)

وہ سارا دن میں نے سائیکل کی گدی پر گزارا۔ اگلے دن جمعہ تھا۔ لہٰذا میری تو ہو گئی تھی عید۔ صبح ہی صبح سائیکل لے کر نکل گیا اور محلے میں مٹر گشت کرنے لگا۔ دوست آئے تو ریسیں لگنی شروع ہو گئیں، جن میں سے اکثر میں نے جیتیں۔ "دوران پرواز" اچانک خیال آیا کہ تالا تو گھر میں ہی رہ گیا ہے کیونکہ عام طور پر تالا ایک خاص جگہ پر سائیکل پر ہی لپٹا رہتا تھا لیکن میں نے سوچا کہ اندر جا کر تالا باہر لانے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے، سو لے آؤں گا۔

دوپہر کے کھانے کے وقت میں واپس آیا۔ سائیکل کھڑی کی اور اندر داخل ہو گیا۔ اندر جاتے ہی مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ اندر خالو جان تشریف فرما تھے۔ میں خوشی سے چلایا۔

"ہرے" اور ان سے لپٹ گیا۔ سلام کرنے اور حال و حوال بتانے میں پانچ منٹ لگے۔ تب کہیں جا کر یاد آیا کہ سائیکل باہر بنا تالے کے کھڑی ہے۔ میں فوراً تالا لے کر باہر نکلا لیکن..... دیر ہو چکی تھی۔ سائیکل غائب تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا اور حواس جواب دینے لگے۔ تصور تصور میں میں نے دیکھا کہ چند نقاب پوش ایک بند وین میں سائیکل کو پکڑے لے جا رہے ہیں اور سائیکل بے چاری آزاد ہونے کے لئے ہینڈل اور ٹائر سمیت چلا رہی ہے۔ ارے لاحول ولا قوۃ۔ میں تیزی سے اتر گیا۔

اسی وقت اندر سے خالو جان کی آواز آئی۔ "کاشی بیٹے! ادھر تو آؤ بیٹا۔" میں نے حواس بحال کئے اور اندر چلا گیا۔ جمیل اور ننھا عرفان بھی وہیں بیٹھے تھے اور خالو جان ان سے ان کی پڑھائی کے متعلق پوچھ رہے تھے۔ میرا ذہین سائیکل میں الجھا ہوا تھا اس لئے سوال گندم جواب چنا والی بات تھی۔ ایک دفعہ خالو جان نے پوچھا۔

"اس بار اسکول میں کون سی پوزیشن لے سکو گے؟"

میں نے جواب دیا۔ "میں نے تو فل اسپیڈ میں چلائی تھی پھر بھی دوسرے نمبر پر آیا۔"

"کیا بات ہے کچھ بدحواس لگتے ہو۔" خالو جان نے مجھے غور سے دیکھا۔

"وہ..... جی..... وہ..... دراصل....." میں گڑبڑا گیا۔

"ہاں ہاں کہو....."

میں نے سوچا بھانڈا تو آخر کار پھوٹ ہی جائے گا۔ بتا دیتا ہوں۔ میں جانتا تھا کہ جواب میں امی کی طنز آمیز جھڑکیاں اور ابو کی پھینٹیاں ہی ملیں گی لیکن اور کوئی چارہ نہ تھا، لہٰذا میں نے اپنی دو روزہ سائیکل کے اغواء کی تمام تفصیل سنا دی۔ اور آخر میں اغواء کنندگان کی ایک شریف پرندے سے راشتہ داریاں بھی جوڑ دیں۔ باتیں سن کر جمیل نے قہقہہ لگایا۔ ہم نے حیرت سے اسے دیکھا جو سب سے بے نیاز ہنسے جا رہا تھا۔ بالآخر وہ بولا۔

"ہاہاہا..... بھائی جان! آپ بھی نرے "وہ" ہیں۔ میں تندور سے روٹیاں لے کر آیا تو سائیکل دھوپ میں کھڑی تھی، میں نے اسے گھر کے عقب میں سائے میں کھڑا کر دیا اور آپ سمجھے کہ..... ہاہاہاہا....."

تمام گھر والے ہنسنے لگے اور میں تھا کہ زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ بالآخر اس شرمندگی سے بچنے کی خاطر میں نے تالا اٹھا کر باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ ویسے اس دن کے بعد کبھی تالا سائیکل سے جدا نہیں ہوا۔

نیا سبق

مرسلہ : کاشف عزیز، کراچی

وقفے کی گھنٹی بجتے ہی سب بچے اپنی کلاس سے باہر نکلنے لگے۔ عامر نے بھی اپنی کتابیں اور کاپیاں بستے میں ٹھونسیں اور اسکول کے گیٹ کی طرف دوڑا جہاں رحیمو گول گپے اور پکوڑے بیچتا تھا۔ عامر نے دو دن سے گول گپے نہیں کھائے تھے۔ ایک دن سے تو اسے جیب خرچ نہیں ملا تھا، اس سے پہلے اس کی جیب پھٹ گئی تھی اور اٹھنی گر گئی تھی۔ رحیمو کی دکان پر پہنچ کر اس نے گول گپے بنانے کو کہا۔ اس وقت رحیمو کی دکان پر بہت بھیڑ تھی۔ کوئی گول گپے مانگ رہا تھا اور کوئی پکوڑوں کے لئے چلا رہا تھا۔ سب لڑکے اپنے ہاتھ آگے بڑھاتے چلّا رہے تھے۔ عامر کو رحیمو نے پکوڑے دے دیئے وہ بھی بغیر چٹنی کے۔ عامر نے اگرچہ گول گپے مانگے تھے مگر وہ بھیڑ کی وجہ سے کچھ نہ بولا اور پکوڑے کھانے پر تیار ہو گیا۔ وقفہ ختم ہونے والا تھا اور رحیمو ابھی تک بچوں کی بھیڑ میں گھرا ہوا تھا۔ اچانک عامر کے ذہن میں ایک خیال آیا اس نے سوچا کہ اگر رحیمو کو اٹھنی دینے کی بجائے وہ اسے بچا لے تو؟ اتنی دیر میں رحیمو کو یاد بھی نہیں رہے گا کہ کس نے پیسے دیئے کس نے نہیں دیئے۔ یہ سوچ کر وہ چپکے چپکے کھسک گیا اور کلاس میں جا بیٹھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اگر چھٹی میں رحیمو نے پوچھا تو وہ کہہ دے گا کہ اس نے تو پیسے دے دیئے تھے۔ وہ اٹھنی بچ جانے کے بعد بہت خوش تھا اور سوچ رہا تھا کہ اسے کہاں خرچ کرے۔

آہستہ آہستہ تمام بچے کلاس میں آ گئے اور وقفہ ختم ہونے کی گھنٹی بج گئی۔ اب حساب کا پیریڈ تھا جو سر طاہر لیتے تھے۔ سر طاہر آئے اور انہوں نے تمام لڑکوں کو کہا کہ فلاں سوال حل کریں۔ عامر نے اپنے بستے میں کتاب ڈھونڈی مگر نہ ملی۔ شاید وہ رحیمو کے خوانچے پر رہ گئی تھی۔ عامر اب سوچ رہا تھا کہ کیا کروں۔ سر طاہر آئے اور کہنے لگے۔ "حساب کی کتاب کہاں ہے؟ کام کیوں نہیں کر رہے ہو؟" کتاب نہ ہونے پر اسے ڈانٹ پڑی اور سر نے سوال دس مرتبہ گھر سے کر کے لانے کو کہا۔

چھٹی کے وقت وہ اپنے دوست نیاز سے باتیں کرتا ہوا جا رہا تھا تو رحیمو نے اسے زور سے پکارا، لیکن عامر آگے بڑھنے لگا۔ آخر رحیمو خود اس کے قریب پہنچ گیا۔ "ارے عامر بیٹا، اپنی کتاب تو لیتے جاؤ۔ وقفے میں تم میرے پاس بھول گئے تھے۔" عامر نے رحیمو سے کتاب لی۔ پیسے بچانے کی حرکت پر اسے شدید افسوس ہو رہا تھا۔ بڑی ہمت کر کے اس نے جیب سے اٹھنی نکالی اور رحیمو کی طرف بڑھائی۔ "یہ لو رحیمو چاچا! میں وقفے میں پیسے دینے بھول

گیا تھا۔"

"کوئی بات نہیں! میں سمجھا کہ شاید پیسے نہیں لائے ہو۔ کل یا پرسوں دے دیتے۔"

عامر کچھ نہ بولا۔ ایمانداری کا اسے ایک نیا سبق ملا تھا۔ آج سے اس نے بے ایمانی سے توبہ کر لی تھی۔ ہمیشہ کے لئے۔

ننھے آنسو

مرسلہ: علی جبران ملک، مخدوم پور

لان سورج کی کرنوں سے نکھرا نکھرا معلوم ہوتا تھا۔ نرم و نازک اور مہکتے رنگ برنگے پھول فضا کو معطر کر رہے تھے۔ گرمی کی شدت سے جان بلب پودے سر جھکائے کھڑے تھے۔ وہ سر جھکائے کسی سوچ میں گم تھی۔

برتنوں کے شور سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کے والدین دوپہر کا کھانا کھا چکے تھے۔ وہ ان چھٹیوں سے پوری طرح لطف نہ اٹھا سکی تھی۔ اسے بخار اور ہیضہ ہو گیا تھا۔ وہ ابھی صحیح طرح صحت مند نہ ہو سکی تھی۔

بانو، اچانک ہی اس کی ماں نے اس کا نام پکارا۔ ادھر آؤ۔ وہ گھبرا کر اٹھی اور پیروں سے گھاس کو کچلتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔ اس کی ماں بہت غصے میں تھی۔ باورچی خانے میں برتنوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس کا باپ کمرے میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ تھوڑے سے بچے ہوئے ٹماٹروں کو دیکھتے ہوئے وہ دستر خوان پر بیٹھ گئی۔ کھانا کھانے کے بعد اس کے باپ نے اسے بلایا اور پوچھا کہ تم کہاں تھیں۔ لان میں بیٹھی تھی کیا کر رہی تھیں۔ پھولوں کو دیکھ رہی تھی اس نے جواب دیا۔ باہر لو چل رہی ہے اس کی ماں نے کہا اب تم اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔ وہ اپنے کمرے میں آگئی اور سونے کی بجائے اپنی الماری کے اوپری خانے سے ایک گول خوبصورت ڈبا نکالا ڈبے کے ڈھکنے پر ایک خوبصورت منظر تھا۔ ایک خوبصورت باغ میں کئی مور ناچ رہے تھے ڈبے میں کبھی سوہن حلوہ ہوتا تھا۔ اس نے ڈھکن اٹھایا اور اس کی نظریں ڈبے کا طواف کرنے لگیں۔ ایک خالص چاندی کا سکہ جس پر ایک ملکہ بنی ہوتی تھی، ایک چھوٹی سی ڈبیہ جس پر چاندی اور سونے کا کام ہوا تھا، ایک کلپ جو سنہری مائل تھا، ایک ڈاک ٹکٹ جو دو سو سال پرانا تھا اور سب سے پیاری چیز ایک پری کا مجسمہ کوف قاف کی پری کا مجسمہ جو اس کو بہت ہی عزیز تھا۔ یہ مجسمہ بہت ہی نازک اور لطیف تھا۔ اس کا لباس سنہری مائل تھا۔ سر پر تاج تھا۔ ہونٹوں پر بہت نفیس مسکراہٹ تھی۔ وہ اس پر نہایت احتیاط سے ہاتھ پھیر رہی تھی کیونکہ مجسمہ نہایت ہی نازک تھا۔ یہ مجسمہ اس نے ایک پھیری والے سے ستر روپے کا خریدا تھا۔ وہ ننھا سا

مجسمہ اس کے سرہانے رکھا تھا۔ اس لمحے اسے نیند آگئی اور وہ گہری نیند سو گئی۔

بانو کے ابا ادھر دیکھو۔ میں دفتر جارہا ہوں اس کے باپ نے کہا۔ ادھر دیکھو تو یہ کیا ہے۔ اوہ یہ پری کا مجسمہ اس کا باپ چلایا یہ تو بالکل اصلی معلوم ہوتا ہے۔ تمہیں کہاں سے ملا۔ بانو کے سرہانے سے اس کی ماں نے جواب دیا۔ اس نے اپنے ڈبے میں بہت سی چیزیں اکٹھی کر رکھی ہیں۔ اسے بیچنا چاہئے۔ یہ ضرور تین چار ہزار کا بک جائے گا۔ اس کے باپ نے کہا۔ اس کی ماں نے اس کے سرہانے دوسرا مجسمہ رکھ دیا۔ اور سوچا کہ جب بانو سو کر اٹھے گی تو وہ اس کی بناوٹ کو نہ سمجھ سکے گی۔ ابھی پانچ سال کی بچی تو ہے ادھر بانو کے کمرے میں دوسرا مجسمہ کئی حصوں میں تقسیم فرش پر بکھرا پڑا تھا۔ اور بانو لحاف میں سر دیئے بلک بلک رو رہی تھی۔

قناعت

مرسلہ: محمد سہیل سلیمان، کراچی

ایک نوجوان بڑا غریب تھا۔ وہ دوسروں کو کھاتے پیتے دیکھ کر اپنی مفلسی پر کڑھتا رہتا تھا۔ اتفاق کی بات ہے ایک دن وہ زمین کھود رہا تھا کہ مٹی میں ایک آدمی کا جبڑا نظر آیا۔ نوجوان اسے دیر تک تکتا رہا۔

دانتوں کی بناوٹ کہہ رہی تھی کہ یہ کسی مضبوط آدمی کا جبڑا تھا، لیکن مٹی میں مل کر اب بھلا کس کام کا رہ گیا تھا یہ دیکھ کر نوجوان میں ہمت سی آگئی۔ اس نے سوچا کہ گوشت پلاؤ اور میوے کھاؤ یا سوکھی روٹی سے پیٹ بھرو، مرنے کے بعد آخر یہی حال ہوتا ہے۔ وہ آدمی بڑا نادان ہے جو اچھے کھانوں کی لالچ میں کڑھتا ہے اور ہلکان ہوتا ہے۔

شوخی تحریر

مرسلہ: محمد اسلم رضا خوری، کراچی

راولپنڈی کے لیاقت میموریل ہال میں غلام فرید صابری قوال کا پروگرام تھا۔ پروگرام کی کمپیئرنگ مشہور کمپیئر دلدار پرویز بھٹی کر رہے تھے۔ وہ درمیان میں لطیفے بھی سناتے جارہے تھے۔ صابری صاحب کو محفل میں بیٹھ کر اپنی قوالی کے انداز میں بہ آواز بلند "اللہ" کہنے کی عادت ہے، لیکن ان کے اس بار بار "اللہ" کہنے سے دلدار بہت اپ سیٹ ہو رہے تھے کیونکہ لوگوں کی توجہ ان کی طرف سے ہٹ جاتی تھی۔ ایک بار ان کے کسی لطیفے کے عین درمیان میں صابری صاحب نے زور سے "اللہ" کہا دلدار نے فوراً روک کر ان سے کہا۔

"اللہ کو اتنا یاد نہ کیا کریں صابری صاحب! اس نے اگر یاد کر لیا تو پچھتائیں گے۔"

قصہ بال کٹوانے کا

مرسلہ: مسرور احمد ریحان، اسلام آباد

بدقسمتی سے ہمیں حجام صاحب سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ اس کی یہ وجہ نہ تھی کہ وہ ہمارا خاندانی دشمن تھا۔ یا اس نے پچھلے ماہ ہمارا کان کاٹنے کی مذموم کوشش کی تھی بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمیں اپنی زلفیں بہت پیاری تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ حجام صاحب ہمارے بال کاٹتے کم اور کھینچتے زیادہ تھے۔

غالباً جدی پشتی نائی تھے اسی وجہ سے اپنے دادا کی قینچیاں، استرے اور دوسری چیزیں ان کے زیر استعمال تھیں۔

ہمارے گلے پر کپڑا اتنے زور سے باندھتے کہ دم گھٹنے لگتا اور شبہ ہوتا کہ شاید پہلے کہیں جلاد کی نوکری کی ہوگی۔

اگر کہیں خارش ہو رہی ہے تو کھجانے کی اجازت نہیں۔ اس وقت تو ہم سے اچھے پتھر کے بت ہوتے ہوں گے۔

اور تو اور حجام صاحب ہماری کھوپڑی کو قابل اعتراض زاویئے پر رکھتے، اور اگر ذرا سی بھی جنبش ہو جائے (کھوپڑی میں) تو اتنی زور سے اسے دوبارہ گھماتے ہیں کہ منکا چرچرا کر رہ جاتا ہے۔

کانوں کے اوپر استرا اس شان بے نیازی سے چلاتے ہیں گویا بال نہیں صاف کر رہے بلکہ بکرے کی کھال اتار رہے ہیں۔

اور ہمیں بال کٹوانے کے لیے بڑی باقاعدگی سے حجام صاحب کا دیدار کرنا پڑتا ہے۔

ایک روز رات کو ہم ٹی وی پر اپنا من پسند پروگرام دیکھ رہے تھے کہ ابو آ گئے اور کہنے لگے۔ "برخوردار تمہارے بال کچھ بڑے لگتے ہیں۔ کل کٹوانے چلیں گے۔ یہ سن کر تو ہمارے پیروں تلے زمین نکل گئی، رنگ فق ہو گیا، ہاتھ پاؤں پھول گئے اور ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

آخر کار وہ منحوس دن آن پہنچا جس دن ہم نے اپنی حسین زلفوں کو کوڑے کے ڈرم کی نظر کر دینا تھا۔

پہلے تو ہم دیر تک لحاف میں دبکے رہے، پھر اٹھے اور غسل خانے میں جا گھسے۔ تھوڑی ہی دیر بعد بھائی جان کی کڑکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"یہ کہاں گیا ہے"۔

جواب میں امی جان کی آواز سنائی دی "بیٹا نہا رہا ہے"۔ "یہ نہانے کا کون سا وقت

ہے۔ اسے چاہئے کہ بال کٹوانے کے بعد نہاتا"۔ بھائی جان کی جھلائی ہوئی آواز ہمارے کانوں سے ٹکرائی۔

"ارے..... بھئی..... نہانے دو..... اتنے عرصے بعد تو غسل خانے میں گیا ہے"۔ امی نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد ہم نہا کر نکلے۔ راہ داری میں جھانک کر دیکھا تو میدان خالی پایا۔

ہم دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر چلے گئے۔ مگر ہائے رے قسمت اوپر باجی صاحبہ مزے سے کینو تناول فرما رہی تھیں۔ وہ چونک کر بولیں "ارے تم یہاں کہاں تمہیں تو نائی کی دوکان پر ہونا چاہئے تھا"۔

ہم بوکھلا کر واپس مڑے ہی تھے کہ سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی اور تھوڑی ہی دیر بعد بھائی جان کا غضب ناک چہرہ نمودار ہوا۔

ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ چھت پر ہی بھاگنا شروع کر دیا۔ اور بھائی جان غصے کے عالم میں "ارے ارے کرتے ہوئے ہمارے پیچھے دوڑنے لگے۔ جلد ہی ہم ان کے مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں تھے۔ انہوں نے ہمیں پکڑا اور سیدھا حجام کی دکان پر لے گئے اور وہاں پہنچ کر انہوں نے حکم صادر فرمایا کہ اس کے سر پر استرا پھیر دیا جائے۔ حکم کی تعمیل بہت فرمانبرداری سے کی گئی اور تھوڑی دیر بعد ہم گھر میں کھڑے سب سے اپنی چمکتی ہوئی چندیا چھپا رہے تھے۔

منتخب حکایات مثنوی مولانا رومؒ
اصل اور فرع

ایک شخص نے نہایت شوق اور محنت سے روپیہ لگا کر مکان بنوایا۔ مکان بن چکا تو اس نے اپنے پیر و مرشد کو خبر کی کہ اگر حضرت اس مکان میں قدم رنجہ فرمائیں تو میرے لئے باعث برکت ہوگا۔ مرشد نے مرید کی یہ درخواست منظور فرمائی اور مکان دیکھنے کے لئے تشریف لائے۔ مکان دیکھا بہت تعریف کی۔ پھر مرید سے پوچھا۔ "میاں یہ روشن دان کس لئے بنوایا؟"

مرید نے عرض کیا "حضرت اس روشن دان کے ذریعے کمرے میں روشنی آئے گی۔" شیخ نے فرمایا "وہ تو میں جانتا ہوں لیکن میاں روشنی تو فرع ہے اصل مقصد تو اس روشن دان کا یہ ہونا چاہئے تھا کہ اس کے ذریعے سے اذان کی آواز مکان میں آئے گی۔ روشنی تو اپنے آپ آتی لیکن نیت اس روشن دان کو تجھے بنوانے کی یہ ہی کرنی چاہئے تھی کہ اس سے اذان کی آواز سنائی دے گی۔"

میرے دوستو! یہ ہے وہ بیش بہا نکتہ جس کی تعلیم آنحضورؐ نے دی ہے کہ "اعمال کا دارومدار انسان کی حسن نیت پر ہے۔"

ساتھی بچپن کے

علی اعوان ۱۲ سال ششم
سائنس ایئر فورس حبیب پبلک اسکول
شاہ محمد بلڈنگ پیرو بڈھا اسٹریٹ رنچھوڑ لائن کراچی

محمد داؤد ۱۶ سال نہم
اسلامیات پروفیسر ایف جی بوائز اسکول
مانسہرہ روڈ ، ایبٹ آباد

شہزادہ فہد ۱۴ سال نہم
سائنس ڈاکٹر ارم اکیڈمی
۱۱۰/۱۴ گلستان کالونی ، نوشہرہ

محمد جنید عالم ۱۲ سال ہفتم
حساب آرمی پبلک اسکول
مکان نمبر ۳۶۱/ ڈی بلاک سی یونٹ ۸ لطیف آباد حیدرآباد

حیدر عباس ۸ سال دوم
انگلش پائلٹ ۵۸۸ ماڈل اسکول
بی-۱۳ بلاک اے کاظم آباد ماڈل کالونی کراچی

فیصل احمد شجراہ ۱۳ سال ہشتم
سائنس ڈاکٹر سندھ ماڈل اسکول
معرفت ڈاکٹر غلام نبی شجراہ چوک کندھ کوٹ

حافظ عابد انور ۱۶ سال نہم
اسلامیات اعلیٰ تعلیم
مدرسہ جامعہ مدینہ بھینس کالونی ، لانڈھی کراچی

محمد حفیظ مبین ۱۵ سال میٹرک
فزکس پائلٹ ماڈرن ہائی اسکول
A-1-1 بیراج کالونی ، سکھر

مصطفیٰ حسن ۸ سال دوم
اردو برائی مٹانا سی وی سینٹ ماڈل
۱۳۹ ریواز گارڈن ، لاہور

نوید اکرم ۱۵ سال دہم
فزکس فوجی افسر علامہ اقبال ہائی اسکول
مکان نمبر ۲-سی/۹۳ یونٹ ۸ لطیف آباد حیدرآباد

محمد فیضان الرب ۱۲ سال ششم
سائنس ڈینٹل سرجن سپر ماڈل اکیڈمی
۵-ای، ۵/۲۴ ناظم آباد نمبر ۵ ، کراچی نمبر ۱۸

عبدالحنان ۱۴سال نہم
انگریزی فوجی افسر آرمی پبلک اسکول
مکان نمبر ۸۲۲ کوٹلی لوہاراں مغربی ضلع سیالکوٹ

جنید رؤف ۱۴سال نہم
بائلوجی ڈاکٹر پبلک آئیڈیل اسکول
۱۳اے/۶۸۵ سعید آباد بلدیہ ٹاؤن۔ کراچی۔ ۵۱

عثمان خلیل ۱۲سال چھٹی
حساب فوجی افسر پی اے ایف کالج
۱۹/اے گلشن آمنہ ملیر ہالٹ، کراچی

شہزاد شفیع ۱۶سال دہم
حساب پتہ نہیں گورنمنٹ وطن اسکول
۱۹ چیمبرلین روڈ، لاہور

محمد عثمان سلیم قریشی ۱۴سال کیمبرج
کیمسٹری انجینئر کریسنٹ ماڈل اسکول
کپورتھلہ ہاؤس۔ لاہور

محمد فاروق شمشیر بھٹی ۱۴سال ہشتم
عربی انجینئر گورنمنٹ ہائر اسکول
محمد انور بھٹی ۱۔۱۷۔۸ کوٹھی نمبر 2۔E ڈونگہ بونگہ

عیسیٰ خان ۱۲سال ششم
سائنس پائلٹ گورنمنٹ مڈل اسکول
معرفت ابراہیم پان ہاؤس شاہی بازار گوادر

ماجد فاروق ۱۴سال نہم
مطالعہ پاکستان انجینئر ہیپی ڈیل گورنمنٹ اسکول
سی-۶ دوست نگر بلاک "کے" نارتھ ناظم آباد کراچی

محمد علی ۱۸سال گیارہویں
اردو مصنف بننا گورنمنٹ اردو کالج
مکان نمبر ۱/۱۵۲ رشید آباد بلدیہ ٹاؤن کراچی ۵۱

شکیل عباس ۱۴سال نہم
اردو ڈاکٹر گورنمنٹ ہائی اسکول
مکان نمبر ۲۱۲/۵ ایم سی بی محلہ مسجد صدیقی چکوال

محمد علی ۲۶سال ایف اے
سائنس اداکار گورنمنٹ سٹی کالج
۸/۱۱۶/۶۹-۲۷ جامع مسجد آزاد میدان ہیرآباد حیدرآباد

آصف علی ۱۶سال گیارہوں
حساب انجینئر ڈگری کالج حیدرآباد
مکان نمبر ۲۵۲ بلاک ۶ لطیف آباد، حیدرآباد

"کوئیز کہانی" میں شرکت کا کوپن

نام _____ کلاس _____

عمر _____ اسکول _____

پتہ _____

_____

اپنے جوابات سادے کاغذ پر لکھئے اور یہ کوپن جواب کے ساتھ منسلک کیجئے۔ بغیر کوپن کے جواب قابلِ قبول نہ ہوگا۔

قلمی دوستی کے سلسلے "ساتھی بچپن کے" میں شرکت کا کوپن

نام _____ عمر _____

کلاس _____ پسندیدہ مضمون _____

مستقبل کا خواب _____

اسکول _____

گھر کا پتہ _____

تصویر اس سائز میں ہو۔

آپ کے نزدیک "دوستی" کا مفہوم کیا ہے۔ (ایک سطر میں) _____

آنکھ مچولی کا سالانہ خریداری کا کوپن

نام _____

مہینہ جس سے رسالہ شروع کروانا چاہتے ہیں _____

رقم _____ بذریعہ _____

پتہ _____

_____

فون نمبر _____

ان سے تعاون کیجیے ان پر اعتماد کیجیے

محمد حسین برادرز	کراچی	۷۷۲۴۱۲۶
سلطان نیوز ایجنسی	لاہور	۵۸۲۴۹
ملک تاج محمد	راولپنڈی	۵۵۴۳۲
مہران نیوز ایجنسی	حیدرآباد	۲۰۱۲۸
افضل نیوز ایجنسی	پشاور	۶۲۵۱۵
اے ایس حامد نیوز سروس	ملتان	۴۳۳۱۰
فیاض بک ڈپو	فیصل آباد	۲۷۴۰۶
ایم ایم ٹریڈرز	کوئٹہ	۷۵۰۰۲
اسلم نیوز ایجنسی	گوجرانوالہ	
سلمان برادرز	نوابشاہ	۲۴۱۴
سعید بک اسٹال	گجرات	۳۶۳۹
پاکستان اسٹینڈرڈ بک اسٹال	سرگودھا	۶۲۹۵۱
طاہر نیوز ایجنسی	جہلم	
کیپٹل نیوز ایجنسی	بہاولپور	۲۹۵۷
چوہدری امانت علی اینڈ سنز	رحیم یار خان	۲۶۲۶
مسلم بک ڈپو	سرائے عالمگیر	
رحمت بک اسٹال	اوکاڑہ	
رہبر نیوز ایجنسی	منڈی مدرسہ ضلع بہاول نگر	
ملک اینڈ سنز	سیالکوٹ	۸۷۹۸۹
سلطانی نیوز ایجنسی	چکوال	
مولا بخش نیوز ایجنسی	مہران مرکز سکھر	
خالد بک اسٹال	گجرات	۳۷۳۱
اسلامی نیوز ایجنسی	وہاڑی	۲۸۸۹

وطنِ عزیز کے قریے قریے

اور نگر نگر

ہر ماہ باقاعدگی سے

آنکھ مچولی

پہنچانے کے لیے ہم نے

ان اداروں

کو اپنا باقاعدہ

ایجنٹ

مقرر کیا

ہے

آنکھ مچولی

خریدنے کے لیے

اپنی تجاویز اور مشوروں کیلئے

ان ناموں پر اعتماد کیجیے

خط وکتابت کے لیے — ماہنامہ آنکھ مچولی، ا- پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

کھلونے

مرسلہ: ضیغم حیدری، کراچی

گڑیا کی ہے شان نرالی
صورت اس کی بھولی بھالی

ٹم ٹم، گھوڑا، بھالو، بندر
بند ہیں یہ ڈبوں کے اندر

کار کی وہ رفتار ہے پیارے
کچھ کہنا دشوار ہے پیارے

ریل کی پیارے بات نہ پوچھو
آنکھیں رکھتے ہو تو دیکھو

گو اس کی ہے رنگت کالی
پٹڑی پر ہے چلنے والی

سارے کھلونے چابی والے
سیدھے سادھے بھولے بھالے

چابی دو تو چلتے ہیں یہ
کتنے دلکش لگتے ہیں یہ

سارے کھلونے پیارے پیارے
عظمیٰ کی آنکھوں کے تارے

امّی ابّو کا صفحہ

نئی نسل کی کردار سازی
اور تربیت کے لئے راہ نما خطوط

ہما سلیم

ہم کبھی خوش ہو جاتے ہیں اور کبھی اداس، کبھی ہمیں غصہ آجاتا ہے تو کبھی رحم اور پیار، کبھی ہم ہنستے اور مسکراتے ہیں تو کبھی غمگین بھی ہو جاتے ہیں۔

یہ سب انسانی احساسات اور جذبات ہیں اور ایک اعتدال کے ساتھ ان سب کیفیات کا ہمارے اندر ہونا ہی ہمیں نارمل انسان ظاہر کرتا ہے۔

میاں بیوی بھی انسان ہونے کے ناطے ایسی کیفیات سے گزرتے ہیں اور کبھی نہ کبھی ان دونوں کے درمیان رنجش، ناراضگی، اختلاف یا ہلکی پھلکی مکالماتی جھڑپوں کی نوبت آہی جاتی ہے۔ اس میں کوئی حرج بھی نہیں اگر یہ اعتدال سے بڑھ نہ جائیں۔ میاں بیوی کے درمیان ہونے والے معمولی جھگڑے اگر شدت اختیار کر جائیں تو اس لڑائی میں سب سے زیادہ زخمی ہونے والی مخلوق، ہمارے اپنے بچے ہوتے ہیں۔

میاں بیوی کے درمیان ہونے والی خانہ جنگی میں بچے کبھی بھی غیر جانبدار نہیں رہ سکتے، وہ بڑوں کے رویّوں سے نتیجے اخذ کرتے ہیں اور اسی کی بنیاد پر غیر محسوس طریقے سے کئی اصول وضع کر لیتے ہیں۔ بڑوں کے احترام میں فرق آجاتا ہے اور بچے میں دھونس دھمکی سے مسئلے کو حل کرنے کا رجحان پرورش پاتا ہے۔ بچے میں خود اعتمادی کی کمی ہو جاتی ہے اور یقین کا شیرازہ بکھرنے لگتا ہے۔

یہ بہت چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جو آگے چل کر بڑے مسائل کو جنم دے سکتی ہیں۔ بچوں کے سامنے جھگڑوں سے گریز، دھیما لہجہ، صاف ستھری اور شستہ زبان میں، ان کی بہتر تربیت اور اچھی شخصیت کا راز پوشیدہ ہے۔

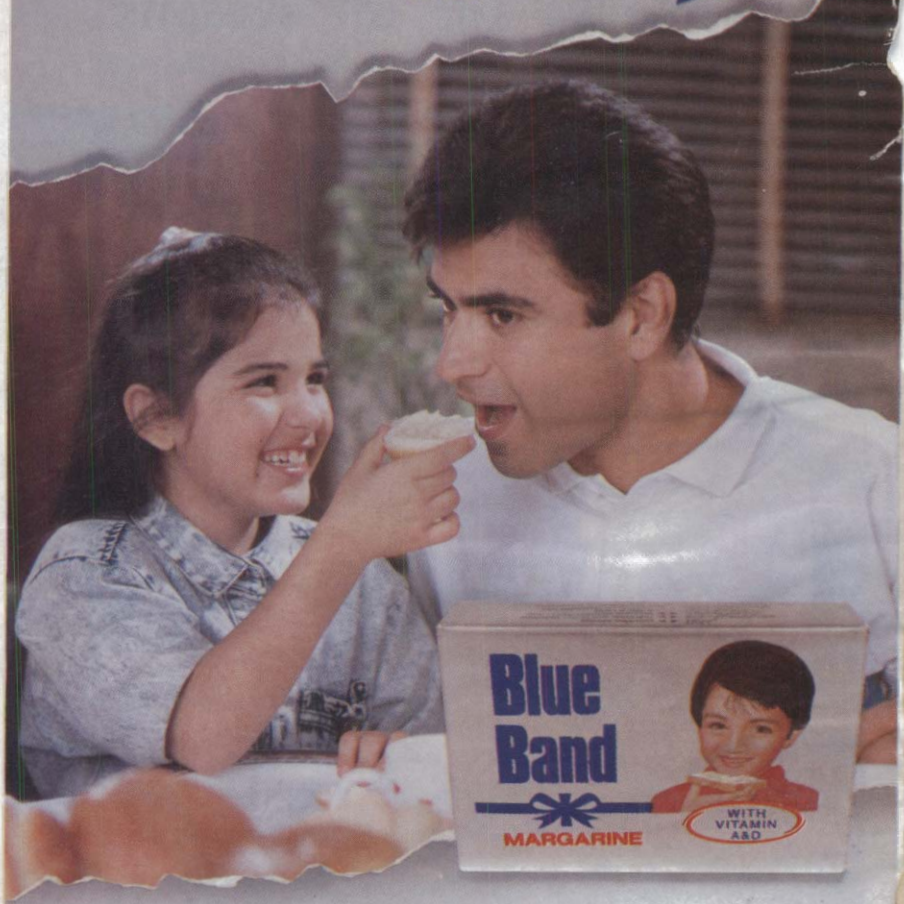

BBM.4-91-UD-C LASER DOT

REGD. No. M-266 JUNE 1992

MONTHLY AANKH MICHOLEE KARACHI

SUPER CRISP

Snacks for all seasons

مزے مزے کے چپس، دال مونگ پی نٹس نمکو مکس اور آب بادام بھی

حفظان صحت کے مطابق

ملاوٹ سے پاک

بین الاقوامی معیار کے مطابق

WINNER OF MERIT
EXPORT TROPHY

Tripple Em (Pvt) Ltd.
72/C-I Gulberg III, Lahore. Pakistan
Ph: 871672 - 876396 - 876797
Telex: 44925 MALIK PK
Fax: 042-870-965

EVERNEW CONCEPTS

NOORAN